پیامِ تعلیم دہلی

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی جامعی۔

قیمت سالانہ عافی پرچہ ۳ر

جلد ۱۹	جنوری سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۱

فہرستِ مضامین

	دعا	مولوی شفیع الدین صاحب نیرؔ	۳
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۴
۲	ہمارے نبیؐ	شاہ معین الدین صاحب ندوی	۵
۳	ہوائی جہاز	طاہر عباسی	۹
۵	ریگستان کی لڑائی	ہاجرہ بیگم صاحبہ	۱۷
۶	کوثر اور ناصر کی شرارتیں	عزیزہ ثریا بنت راشد حسین	۲۲
۷	نئی کتابیں۔	... ...	۲۴
	جوجو	اظہر علی صاحب فاروقی	۲۵
	کراس اسٹیج میں بیل	زہرا خاتون	۲۶
	تلادانی	درۃ البیضا بیگم صاحبہ	۳۰
	خوشی کی قید	... ...	۳۲
	تنگا پربت	سید احسن صاحب ایم اے	۳۳

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی۔ محبوب الم... یس

پیام تعلیم کے نئے خریدار

ہیڈ ماسٹر صاحب مکتب امریا۔ بیلی بھیت
حاجی محی الدین خاں صاحب ۔ ناگپور
سید غلام قاسم شاہ صاحب۔ میرن شاہ۔
دھی احمد صاحب ۔ سرائے عاقل الہ آباد
ٹاؤن اسکول ۔ اصغری پور
محمد حبیب اللہ صاحب ۔ ترد پتر
مولینا محمد سعید خاں صاحب ۔ الہ آباد
سکرٹیری صاحب انجمن مفید الطلبا ۔ زگون
سید افضل امام صاحب ۔ کھگول
صغیر احمد خاں صاحب۔ حیدر آباد دکن
مکرم باتو صاحبہ ۔ رائچور۔
سکرٹیری صاحب امن سبھا پبلک لائبریری گونڈہ
سلطان احمد صاحب صدر بازار دہلی
مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ۔ رانچی
ایم سلیمان خاں صاحب ۔ اکولہ ۔ برار
محمد بدیع الزماں صاحب ۔ احمد نگر
ہیڈ مولوی یو پی اسکول ۔ مادھو پور
اے ۔ زمرد صاحب ۔ کھردی
گورنمنٹ اردو مڈل اسکول ۔ تاریکیر
مسٹر آربٹ صاحب ۔ حیدر آباد دکن

سید حامد علی صاحب ۔ حیدر آباد دکن
عبدالرحمٰن حاجی بدرالدین صاحبان بیادر
امین الدین صاحب ۔ بی اے ۔ لاہور
ذوالفقار احمد صاحب ریاست رامپور
سکریٹری صاحب لٹریری ایسوسی ایشن رام پور
اسٹوڈنٹ عثمانیہ کالج ۔ ورنگل۔
کنڈوا مسلم اسکول ۔ بنگال
عطاء الرحمٰن صاحب اسسٹنٹ سرجن ۔ کھنڈوا
گورنمنٹ ہائی اسکول۔ چادر گھاٹ دکن
اسلامیہ ہائی اسکول۔ لائل پور
محمد اختر خاں صاحب یوسف زئی آگرہ
سکریٹری صاحب ریڈنگ روم ۔ مین پوری
ایس جی محی دین صاحب چناگری
پرنسپل صاحب ماڈرن ہائی اسکول۔ دہلی
محمد ظہیر صاحب قریشی ۔ بھوپال اسٹیٹ
احسن محسن علوی و عبدالحی علوی صاحبان کاکوری
فرخ حسن صاحب ۔ مالیر کوٹلہ اسٹیٹ
محمد سمیع اللہ صاحب ۔ چادر گھاٹ دکن
گورنمنٹ مڈل اسکول ۔ پٹن
ملک عزیز احمد صاحب ۔ بلگی۔ گیا۔

منیجر صاحب بزم ادب۔ ٹونک راج۔
مس امام اینڈ شاہ امام صاحبہ بریلی
مدرسہ فوقانیہ ۔ ناندیڑ
جی، کے پوپلیہ۔ نیو دہلی
گورنمنٹ ہائی اسکول۔ داموہ
" " " بیڑ۔
شمیم آرا رحمٰن صاحبہ پٹنہ
نیاز احمد صاحب ۔ جون پور
جعفر حسن صاحب ۔ حیدر آباد دکن۔
ماسٹر اومیش پرشاد توکلی صاحب جھانسی
سکریٹری صاحب ڈبٹنگ سوسائٹی ۔ منگلور
عبدالنصیر صاحب ۔ بھاگل پور سٹی
صداقت حسین صاحب قریشی ۔ پانی پت
انیس الرحمٰن صاحب دہلی
محمد اصغر علی صاحب ۔ بہار شریف
پربھو دیال صاحب ۔ علی پور
فہمیدہ خاتون صاحبہ۔ علی گڑھ
میسرز ایچ ایم فہیم الدین اینڈ سنز۔ کانپور
خوشید النور صاحب ۔ پھگواڑہ
شیخ انوار الحق صاحب ۔ فیروز پور چھاؤنی

دعا

از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیّر۔ کوچہ تاراچند دہلی

ہاتھ اُٹھائے سر کو جھکائے
رحم پہ تیرے آس لگائے

آئے ہیں یارب! تیرے دَر پر
اپنے کرم کی ہم پہ نظر کر

آرزوئیں کچھ دل میں بھری ہیں
آنکھیں تیری سمت لگی ہیں

قدرت سے دن پھیر ہمارے
ہم ہیں ترے محبوب کے پیارے

ہم کو بنا اسلام کا شیدا
اور صرف اپنے نام کا شیدا

نام پہ تیرے جان فدا ہو
کوئی نہ دل میں تیرے سوا ہو

سیدھی راہ دکھا دے ہم کو
سچ مچ نیک بنا دے ہم کو

ہوں سب مسلم بھائی بھائی
باقی رہے کچھ بھی نہ جُدائی

قوم کو دل سے پیار کریں سب
قوم کا بیڑا پار کریں سب

باتیں ہی باتیں نہ بنائیں
کام کریں کچھ کر کے دکھائیں

ظلم کی تاریکی کو مٹا دیں
باطل کی دیواریں ڈھا دیں

علم و ہنر سے شاد ہمیں کر
فکروں سے آزاد ہمیں کر

دین میں اور دنیا میں بھلا ہو
نیّر کی پوری یہ دعا ہو

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

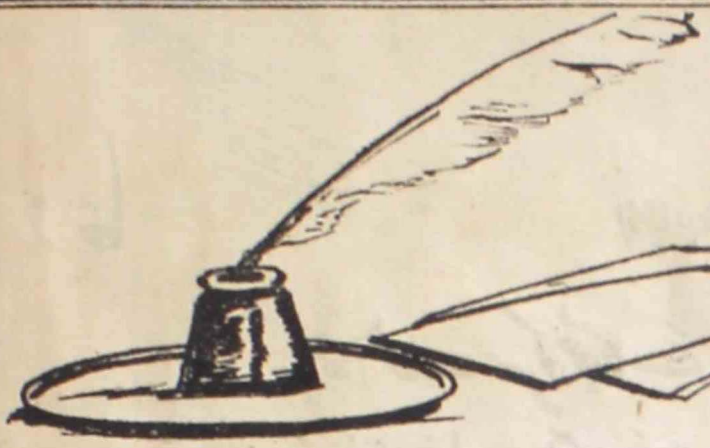

بچّوں سے باتیں

اب کی سال گرہ نمبر اُمید کے خلاف بہت دیر سے نکلا۔ اس کے انتظار میں تمھیں جو تکلیف ہوئی اس کا اندازہ تمھارے خطوں سے ہوتا تھا۔ جواب تک سینکڑوں کی تعداد میں آتے رہے۔ ہم نے اپنے اندازکے مطابق رسالہ ٹھیک وقت پر ترتیب دے دیا تھا چھپنے میں بھی کچھ دیر نہیں لگی۔ مگر ایکا ایکی کچھ ایسی رکاوٹ پیدا ہوئی کہ باوجود سخت کوشش کے رسالہ وقت پر نہ نکل سکا۔ اور اب اور تب میں اتنے دن گذر گئے

اس تاخیر کی وجہ سے انتظام میں کچھ بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے۔ بچوں کی انجمن کے بارے میں تمھاری رائے کا ہمیں انتظار ہے فروری سے ہم اس کا انتظام کرنے والے ہیں اس لئے جواب جلد سے جلد دو۔ تصویریں بھی رنگ بھر کر تم نے نہیں بھیجی ہیں وہ بھی بھیج دو۔ معمہ بھی حل کرنا باقی ہے۔ فروری میں انعام کا اعلان ہوگا۔

یہ پرچہ قصداً دیر سے شائع کیا جارہا ہے۔ آیندہ اللہ نے چاہا تو وقت پر شائع ہوگا

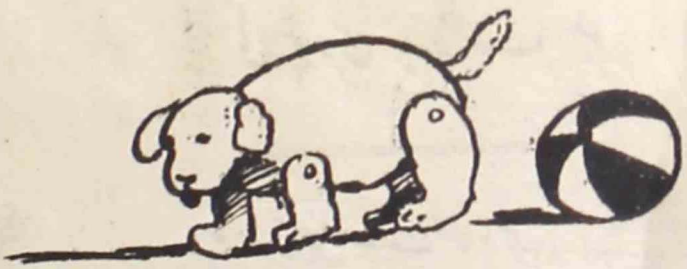

ہمارے نبیؐ بچّوں کے ساتھ

از جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

تم نے اپنے بزرگوں کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم (اللہ نے اُن پر درود اور سلام بھیجا) کا پاک ذکر کرتے وقت رحمۃً للعالمین کا لفظ سُنا ہوگا۔ شاید تم میں سے بہت سوں کو اس کا مطلب نہ معلوم ہو اچھا آؤ آج ہم تمھیں بتائیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں ساری دنیا کے لئے رحمت اور محبّت۔ یعنی ہمارے پیارے نبی کے دل میں رحم محبّت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لوگوں کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو اپنی مصیبت اور پریشانیاں سمجھتے تھے۔ اُنھیں دُور کرنے کی کوشش کرتے تھے دُکھ سُکھ میں کام آتے تھے اور رنج وغم کے شریک تھے۔ انسان تو انسان جانوروں تک کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ لوگوں کو جانوروں کے ساتھ بے رحمی کے سلوک سے منع کرتے تھے اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک، اُن سے محبّت اور اُنھیں دانہ گھاس اور چارہ کھلانا، اُنھیں آرام سے رکھنا ثواب کا کام بتاتے تھے۔

اب تم ہی اندازہ کرو کہ ایسے محبّت والے نبی کا برتاؤ بچّوں سے کیسا ہوگا۔ آج تمھارے پیام تعلیم نمبر میں ہم اسی کے بارے میں کچھ لکھ رہے ہیں۔

اللہ میاں نے اولاد کو دنیا کی زینت کہا ہے

اور بالکل سچ ہے۔ اسی لئے ہمارے نبی کو اپنی اولاد اور دوسرے بچوں سے بڑی ہی محبت تھی فرمایا کرتے، دُنیا ایک باغ ہے اور بچے اس باغ کے پھول ہیں کہ اُن سے سارا گھر مہکتا ہے۔ اور بھائی حقیقت بھی یہی ہے، دیکھو جو گھر بچوں یعنی تم سے خالی ہو وہ کیسا اُداس معلوم ہوتا ہے۔

جو لوگ بچوں کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش نہ آتے تھے آپ اُنھیں اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بچوں کو پیار کر رہے تھے ایک بدو آیا، ذرا اُجڈ سا تھا۔ کہنے لگا، تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں لیکن میں کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ تمھارے دل سے محبت چھین لے تو میں اسے کیا کروں۔

نماز میں بھی آپ بچوں کا خیال رکھتے تھے اُس زمانے میں عورتیں بھی جماعت کے ساتھ ہی نماز پڑھتی تھیں۔ ایسی حالت میں کسی بچے کے رونے کی آواز سُن لیتے تو نماز کو مختصر کر دیتے کہ ماں کی علیحدگی سے بچے کو تکلیف نہ ہو۔

آپ کی ایک نواسی امامہ تھیں انھیں نماز میں بھی جُدا نہ کرتے اور انھیں لئے لئے نماز پڑھتے رکوع اور سجدے میں جاتے تو گود سے اُتار کر پاس بٹھا دیتے کھڑے ہونے کے بعد پھر اٹھا لیتے۔

حضرت حسنؓ و حسینؓ کے ساتھ آپ کو بڑی محبت تھی انھیں اپنے کندھوں پر سوار کر کے نکلتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت حسنؓ یا حسینؓ کو اس حالت میں دیکھ کر کہا۔ میاں صاحبزادے تمھاری سواری کتنی اچھی ہے رسول اللہؐ نے فرمایا سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔

ایک مرتبہ آپ خُطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں حسنؓ و حسینؓ سُرخ کُرتا پہنے خراماں خراماں آتے دکھائی دئے۔ اُن کو دیکھ کر آپ منبر سے اُتر آئے اور دونوں کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ آپ کبھی کبھی انھیں چادر میں چھپا کر نکلتے۔ ایک مرتبہ اُن کو چھپائے ہوئے تھے، ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہؐ چادر میں کیا ہے، آپ نے اس کو کھولا تو اُس میں دو خوبصورت کھلونے (حسنؓ و حسینؓ) نکلے۔

آپ کے اس لطف و محبت کی وجہ سے دونوں بھائی آپ سے بہت شوخ ہو گئے تھے، جہاں آپ کو دیکھتے دوڑ کر گلے سے لپٹ جاتے۔ کبھی سینے پر

چڑھ جاتے، کبھی کندھوں پر سوار ہو جاتے، کبھی کبھی تو نماز کی حالت میں بھی شوخی سے باز نہ آتے۔ لیکن رسول اللہ صلعم برا نہ مانتے، رکوع کی حالت میں دونوں ٹانگوں کے درمیان گھس جاتے۔ آپ ٹانگیں پھیلا کر اُن کے نکلنے کے لئے راستہ بنا دیتے، کبھی سجدے میں اُچک کر پیٹھ پر سوار ہو جاتے آپ اُن کے گرنے کے خیال سے اس وقت تک سر نہ اٹھاتے جب تک دونوں اُتر نہ جاتے۔

غلاموں کے بچوں کے ساتھ بھی اسی لطف و محبت کا برتاؤ تھا، آپ کے ایک غلام زید بن حارثہ تھے، اُن کے بچہ اسامہ کو حسنؓ کے ساتھ زانو پر بٹھا کر دونوں کے لئے دعا کرتے۔

غیر کے بچوں کے ساتھ بھی اسی لطف و محبت سے پیش آتے تھے جس کا بچہ مل جاتا پیار کرتے اُس سے لطف و محبت کی باتیں کرتے۔ جب کہیں باہر سے تشریف لاتے تو جو بچہ راستے میں مل جاتا اُسے اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ فصل کا کوئی نیا میوہ آتا تو جو سب سے چھوٹا ہوتا اُسے پہلے مرحمت فرماتے جب کوئی ایسا تحفہ آتا جو بچوں کے لائق ہوتا تو اُسے سب سے چھوٹے بچے کو عنایت فرماتے۔ ایک مرتبہ کہیں سے کپڑے آئے، ان میں بچیوں کے لائق سیاہ آنچل کی چادر تھی۔ اسے آپ نے ایک چھوٹی بچی اُمّ خالد کو بلا کر اڑھایا اور اُس کے بولے اُمّ خالد کو دکھا کر حبشی زبان میں (یہ بچی حبشہ میں پیدا ہوئی تھی اور حبشی زبان سمجھتی تھی) فرمایا اُمّ خالد کیسے اچھے بوٹے ہیں۔

ہجرت کے وقت جب آپ مدینے تشریف لے گئے تو انصار کی چھوٹی چھوٹی بچیاں آپ کے آنے کی خوشی میں اپنے گھروں سے نکل کر گیت گانے لگیں، آپ نے ان سے فرمایا۔ بچیو کیا تم مجھے پیار کرتی ہو۔ انھوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا میں بھی تمھیں پیار کرتا ہوں۔

آپ تعلیم و تربیت کے لئے بھی بچوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے نہ تھے بلکہ پیار سے سمجھا دیتے تھے ایک صاحبزادے کا معمول تھا کہ کھجور کے باغوں میں جا کر خوب ڈھیلے بازی کرتے۔ ایک مرتبہ انھیں لوگ رسول اللہ کے پاس پکڑ لائے، آپ نے اُن سے پوچھا کیوں میاں ڈھیلے کیوں مارتے ہو

یہاں ہوائی جہاز سے پہلے غبارے کا بھی کچھ ذکر کر دیں۔ غبارہ اور ایرشپ اس اصول پر بنے ہیں کہ ان میں ہائیڈروجن یا ہیلیم (HELIUM) گیس ہوتی ہے جو ہوا سے بھی ہلکی ہوتی ہے۔ اس گیس کو بھرنے کے بعد غبارہ جب اونچا ہو جاتا ہے تو جب تک چاہیں اُسے ہوا میں قایم رکھ سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص انجن کی ضرورت نہیں لیکن اُسے کسی طرف موڑا نہیں جا سکتا جدھر کی ہوا ہوگی اُسی طرف کو وہ بھی جائیگا ایرشپ بھی غبارے کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اُس میں علاوہ گیس کے انجن بھی ہوتا ہے گیس کا کام یہ ہے کہ ایرشپ کو ہوا میں قایم رکھے اور انجن کا یہ کہ اُسے جس طرف چاہے لے جائے۔ یہ دونوں ہوا سے ہلکی چیزیں ہیں۔

ہوائی جہاز یعنی ایروپلین کی ساخت (بناوٹ) ایرشپ اور غبارے سے مختلف ہوتی ہے۔ ایروپلین ہوا سے وزنی چیز ہے۔ اسے ہوا میں اٹھانے اور قایم رکھنے کے لئے مشین یا کسی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ طاقت ہوائی جہاز کے موٹر سے حاصل ہوتی ہے۔ موٹر سے جہاز کا پنکھا گھومتا ہے جس سے وہ ہوا میں قایم رہتا ہے۔

ویسے تو (جیسا تم پڑھ چکے ہو) ہوا میں اُڑنے کی کوشش انسان بہت زمانے سے کر رہا ہے مگر کامیاب کوشش ۱۸۹۰ء کے بعد سے شروع ہوئی۔ اسوقت کچھ لوگوں نے ایسے پر بنائے تھے جنہیں جسم میں لگا کر وہ پہاڑیوں کے نیچے کی طرف دوڑتے تھے یہانتک کہ ہوا اُن کو سنبھال لیتی تھی۔ تھوڑی دیر تک ہوا میں معلق رہ کر وہ تیرتے ہوئے نیچے آجاتے تھے۔ ان میں پہلا اور خاص آدمی اوٹو للی انتھل تھا۔ اس نے کئی سال تک غور و محنت کے بعد دو لمبے لمبے پر بنائے تھے، یہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے ان کے بیچ میں ایک کھڑی ہوئی دُم سی تھی، دونوں پروں کے بیچ میں ایک سوراخ تھا۔ للی انتھل اس میں سے اپنا سر اور بازو نکال لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک پہاڑی سے نیچے کی طرف دوڑتا تھا۔ تھوڑی دور جاکر ہوا اُسے اٹھا لیتی تھی اور پاؤں زمین سے اونچے ہوتے جاتے تھے۔ اُڑان کا فاصلہ ہوا کی تیزی اور دوسری چیزوں پر منحصر تھا۔ اپنے چار پانچ سال کے تجربے کے زمانے میں وہ تین سو گز کے فاصلے تک اُڑا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں وہ پروں میں ایک قسم کی نئی دُم لگا کر تجربہ کر رہا تھا کہ گر کر مر گیا۔ ایک انگریز للی انتھل کے تجربے دیکھا کرتا تھا اُسے بھی شوق پیدا ہوا اور للی انتھل کی طرح تجربے کرنے لگا اُس نے یہ نئی بات کی کہ اپنے پروں کے نیچے کے حصے میں پہیے بھی لگائے۔ اب بجائے دوڑنے کے زمین پر تیزی سے کھینچا جاتا تھا جس سے وہ ہوا میں اُٹھ جاتا تھا وہ کوئی ڈھائی سو گز تک اُڑنے میں کامیاب ہو گیا تو چار گھوڑوں کی طاقت کا پٹرول کا انجن بھی بنایا۔ مگر اس انجن کے پروں میں لگانے کی نوبت نہ آئی اور وہ بے چارا اپنے گلائڈر[1] کے ہوا میں ٹوٹ جانے کی وجہ سے مر گیا۔

امریکہ میں بھی للی انتھل کے شاگرد اور چند اور لوگ تجربے کرتے رہے اور انہوں نے آنے والے ہوابازوں کے لئے کافی مسالا جمع کر دیا۔ دو رائٹ بھائی، آر ول اور ولبر بھی (جن کی بائسکل کی دکان تھی) گلائڈر سے تجربے کر رہے تھے انہوں نے ۱۹۰۰ء میں ایک گلائڈر بنایا جو دو منٹ تک

[1] گلائڈر کا حال پیام مارچ ۱۹۳۶ء میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

ہوا میں قایم رہا۔ دوسرے سال انہوں نے ایک بڑی مشین بنائی اور وہ کوئی چار سو فٹ اُڑنے میں کامیاب ہوئے۔

انسان کی پہلی اُڑان

۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء پرواز (اُڑان) بلکہ دنیا کی تاریخ میں اہم دن ہے کیونکہ اُس دن ایک انسان ہوا سے زیادہ وزنی مشین کو ہوا میں لے جانے میں کامیاب ہوا تھا اور اُسے وہاں قایم بھی رکھا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اُس روز کئی کامیاب تجربے کئے۔ ایک دفعہ تو وہ میل بھر مسلسل اُڑتے رہے۔ دو سال بعد ۱۹۰۵ء میں دونوں بھائیوں نے ایک اور مشین بنائی جس پر وہ ایک بار ۲۴ میل تک اُڑے اور ایک دفعہ ۳۸ منٹ تک ہوا میں قایم رہے۔ یہ مشین ابھی تک سائنس میوزیم میں ہے۔ اُن کے اُڑنے کی افواہیں دنیا میں پھیل رہی تھیں مگر کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں دونوں بھائی اپنا جہاز فرانس میں لائے اور ساڑھے ستتر ۷۷½ میل اُسے اڑا کر سب کو دکھا دیا۔ اس موقع پر ایک فرانسیسی آدیر کا ذکر بھی ضروری ہے یہ بھی ۱۸۹۷ء میں کچھ فاصلے تک اُڑنے میں کامیاب ہوا تھا۔ لیکن اُس کی مشین ٹوٹ گئی اور بے چارہ پھر کبھی نہ اُڑ سکا۔

رائٹ بھائیوں کے اُڑنے سے پہلے چند اور لوگوں نے بھی مشینیں بنائی تھیں، ان میں سے بعض کارآمد بھی تھیں گو دیکھنے میں بے تکی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اُسوقت تک ایسے انجن نہیں بنے تھے جن کے ذریعے وہ آج کل کی طرح خود بخود زمین سے اُٹھ سکیں اُسوقت ایسے تجربہ کار ہوائی باز بھی نہ تھے جو ان مشینوں کو ہوا میں لے جا کر قابو میں رکھ سکیں۔ رائٹ بھائیوں نے پہلی بار ایسی مشین بنائی جو اُڑ سکتی تھی۔ بعد میں ایک اور ہوا باز نے بھی اپنی مشین بنائی اور اُس پر بیٹھ کر اور پورے قابو کے ساتھ اُڑ کر یورپ والوں کو حیران کر دیا تھا۔ یہ مشین بھی دیکھنے میں عجیب ہے تصویر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُلٹی اُڑ رہی ہے مگر بات یہ ہے کہ رائٹ کے جہازوں میں دُم نہیں ہوتی تھی۔ ہوا باز کے پیچھے ایک مسافر کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور یہ انجن کے قریب خوب گرم رہتا تھا اس کے قریب وہ زنجیریں شور مچاتی تھیں جن سے ہوا جہاز کا پنکھا گھومتا تھا۔

ایک اور مشین جو رائٹ کی مشین سے بھی زیادہ مشہور ہوئی ہنری فارمین نے بنائی تھی۔ ان دونوں مشینوں کی رفتار بہت سُست تھی ان کا اُڑانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا فارمین کی مشین بڑی لڑائی تک استعمال ہوتی رہی۔

پہلا ہوائی جہاز

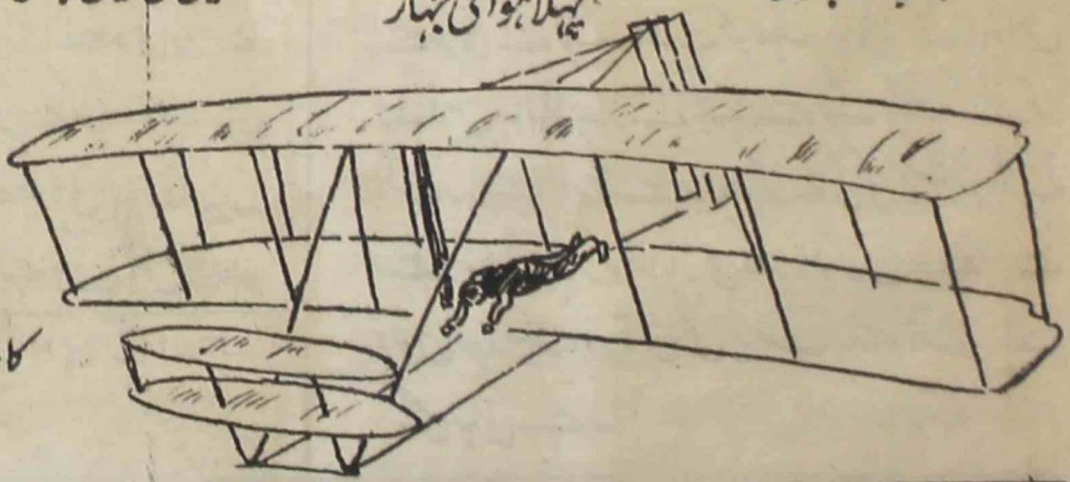

(یہ جہاز ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو پہلی مرتبہ کامیابی کے ساتھ اُڑا تھا)

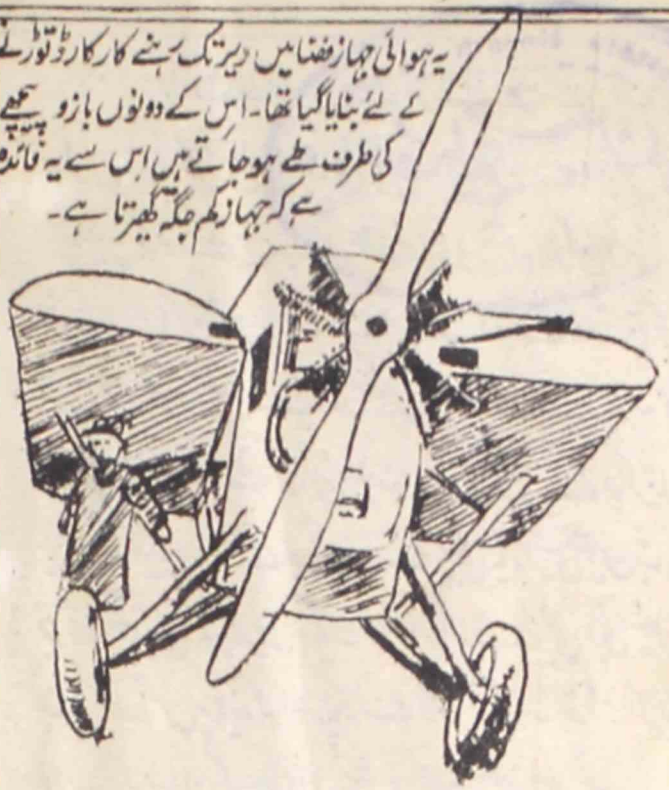

یہ ہوائی جہاز فضا میں دیر تک رہنے کا رکارڈ توڑنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کے دونوں بازو پیچھے کی طرف طے ہو جاتے ہیں اس سے یہ فائدہ ہے کہ جہاز کم جگہ گھیرتا ہے۔

ایک انگریز ہوا باز مسٹر اے۔ وی۔ رو نے بھی ایک ہوائی جہاز بنایا تھا یہ ٹرائی پلین[1] تھا۔ ان دنوں کسی کام کے شروع کرنے والے کو عجیب عجیب دقتیں پیش آتی تھیں۔ مثلاً یہ قانون تھا کہ ہوائی جہاز میں اڑنا جرم ہے۔ ایک دفعہ مسٹر اے۔ وی۔ رو اڑنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ ایک سرکاری آدمی ہوائی جہاز اڑانے کے میدان میں بھیجا گیا کہ وہ انہیں اڑنے سے روکے۔ مگر جب تک وہ پہنچے اے وی رو اپنا تجربہ ختم کر چکے تھے۔ ان کا یہ ٹرائی پلین بہت کامیاب ہوائی جہاز رہا۔ اب تک کسی کو ٹرائی پلین بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مسٹر اے وی رو نے اس میں نو گھوڑوں کی طاقت کا انجن لگا کر اسے کامیابی سے اڑا بھی لیا۔ اسوقت معمولی اور ہلکے ہوائی جہازوں میں نو گھوڑوں کی طاقت کا انجن لگتا ہے۔ لیکن اس وقت پچاس گھوڑوں کی طاقت کا نوم (Gnome) انجن آخری حد سمجھا جاتا تھا۔ یہ مشین اب بھی لندن کے سائنس میوزیم میں رکھی ہے۔

دیکھا دیکھی بہت سے لوگوں نے مشینیں بنا ڈالیں ان میں اکثر تو ایسی تھیں کہ اڑ ہی نہیں سکتی تھیں۔ کچھ اڑیں بھی تو فوراً زمین پر گر کر ٹوٹ گئیں لیکن ان لوگوں کی ہمت اور کوشش بہر حال تعریف کے قابل ہے۔

انگریزی ہوا بازوں میں گرہم وھائٹ مشہور ہوا باز تھا۔ ایک دوسرے ہوا باز پالہن سے لندن سے مانچسٹر تک اڑنے میں اسکا مقابلہ ہوا۔ انجن کی خرابی کے سبب اسے روانہ ہونے میں کچھ دیر ہو گئی، اس خیال سے کہ پالہن کہیں اسے ہرا نہ دے وہ رات کے اندھیرے میں روانہ ہو گیا۔ یہ ہوا کے ذریعہ رات میں پہلا سفر تھا۔ ہوائی ڈربی کی پہلی دوڑ (۱۹۱۲ء) میں بھی وہائٹ نے حصہ لیا تھا۔

اس زمانے میں ہوائی جہازوں کے متعلق واقفیت بہت کم تھی۔ مثلاً اب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہوائی جہاز یکایک کسی طرف مڑتا ہے تو اسے ایک طرف ضرور جھکنا پڑتا ہے (تم نے دیکھا ہوگا کہ بالسکل یا ریل تیزی سے مڑتی ہے تو ایک طرف کو جھک جاتی ہے) مگر اس زمانے میں ہوائی جہاز کے جھکنے سے لوگ سمجھتے تھے کہ الٹ رہا ہے اور اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہوائی جہاز کو قلابازی کھلانا لوگوں نے بہت دنوں بعد سیکھا اور آج کل یہ سب سے آسان بات سمجھی جاتی ہے۔

[1] مونوپلین۔ ایک پر والا۔ بائی پلین۔ دو پروں والا اور ٹرائی پلین تین پروں والا ہوائی جہاز

شروع میں مشینیں زمین سے سوفٹ بھی مشکل سے اونچی ہوتی تھیں۔ پہلی دفعہ جب ایک ہوا باز اپنا جہاز ایک میل کی اونچائی پر لے گیا تو اُسے لوگ خدا جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب ہوا باز اُسی وقت اطمنان سے اُڑتے ہیں جب ان کا جہاز زمین سے بہت اونچا ہو۔ اس لئے کہ اگر مشین بگڑ جائے تو زمین تک آتے آتے اُس کو سنبھالنے کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے۔ شروع شروع میں جن باتوں پر بحث کی جاتی تھی ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مونوپلین[1] زیادہ کامیاب ہے یا بائی پلین[2]۔ اور تعجب ہے کہ یہ جھگڑا اب تک طے نہ ہو پایا۔ اسی لئے کبھی مونوپلین زیادہ مقبول ہوتے ہیں اور کبھی بائی پلین۔ سب میں مشہور مونوپلین بلیریو تھا جس نے ۱۹۰۹ء میں لوئی بلیریو نے اس پر انگلش چینل کو طے کیا تھا۔ یہ مشین اُس زمانے کی بڑی اور مشہور مشینوں کے مقابلے بظاہر بہت کمزور اور نازک تھی۔ لیکن اس کی رفتار اور کامیابی نے ثابت کر دیا کہ اس کا چھوٹا ہونا کوئی نقصان کی بات نہیں۔ ایک اور مونوپلین جو سانتوس دومونے بنایا تھا اس سے بھی چھوٹا تھا۔ یہ بانس سے بنایا گیا تھا۔ غالباً اس سے ہلکا ہوائی جہاز اب تک نہیں بنا۔ بدقسمتی سے یہ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ کئی تجربوں کے بعد اس کا نام غصیلا انڈا پڑ گیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ہوا باز کے بیٹھنے کی جگہ بھی بدل دی گئی اور بجائے پروں کے یہ جگہ ہوائی جہاز کے جسم میں بنائی گئی۔ جب ہوائی جہازوں نے یہ شکل اختیار کی تو آج کل کے ہوائی جہاز سے زیادہ مشابہ ہونے لگا۔

پہلے جہاز میں چلانے کے لئے دو جگہیں نہ تھیں کہ اُستاد اور شاگرد دونوں ایک ہی ساتھ بیٹھ کر سیکھ سکتے بلکہ نوسکھوں کو چھوٹا سا ہوائی جہاز دیا جاتا تھا اس کے پر بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے۔ وہ میدان میں ہوائی جہاز کو دوڑاتا اور تھوڑے تھوڑے فاصلے کی اُڑان لیتا پھرتا۔ پورا ہوائی جہاز اُسے بعد میں دیا جاتا جس پر وہ کچھ فاصلے تک اچھی طرح اُڑ سکے۔ مگر اب جہاز میں اُستاد اور شاگرد دونوں کے لئے انتظام ہو گیا ہے۔ اگر شاگرد کوئی غلطی کرے تو اُستاد بیٹھے بیٹھے اُس غلطی کو ٹھیک کر سکتا ہے۔

اُس زمانے میں عموماً یہ خیال تھا کہ بہت کم آدمی کامیابی کے ساتھ اُڑنا سیکھ سکتے ہیں لیکن آج کل یہ حال ہے کہ ہوا بازی کی تعلیم میں موٹر چلانا سیکھنے سے بھی کم وقت لگتا ہے۔

اس زمانے میں بہت کم جہاز ایسے تھے جو اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے یا اُن پر ایک سے زیادہ آدمی بیٹھ سکتا۔ ۱۲۵ میل تک ہوائی جہاز کا سفر کمال سمجھا جاتا تھا۔ اگر ان لوگوں سے کہا جاتا کہ بیس سال کے اندر اندر ہوائی جہاز کی رفتار ۳۶۰ میل فی گھنٹہ ہو جائیگی یا یہ کہ ایک جہاز میں ۱۶۹ آدمی بیٹھ کر اُڑ سکیں گے یا ایک ہوائی جہاز بغیر اُترے ہوئے چار ہزار میل تک اُڑ سکیگا۔ تو اُنہیں کبھی یقین نہ آتا۔

بڑی لڑائی میں ہوائی جہاز بہت ہی کارآمد اور مفید ثابت ہوا۔ اس کے ذریعہ دشمن پر گولہ باری کی جا سکتی تھی۔

---

[1] ایک پہیہ والا جہاز [2] دو پر والا جہاز

دشمن کی فوجیں اور لڑائی کا سامان دیکھا جا سکتا تھا۔ اسی لئے اس نے لڑائی کے زمانے میں غیر معمولی ترقی کی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک صرف چار سال میں اس نے جتنی ترقی کر لی وہ بیس سال میں بھی مشکل سے ہو سکتی۔ ہوائی جہاز کو قلابازی کھلانا۔ زمین کی طرف گرانا اور اس موقع پر اس پر قابو بھی رکھنا ان سب باتوں میں ہوابازوں نے لڑائی کے زمانے میں مہارت حاصل کی۔

بم باز ہوائی جہاز پہلے ہنڈلے پیج بنائے تھے ان میں ایک سے زیادہ انجن لگائے جاتے۔ بعد میں ایک اور بم باز ہوائی جہاز میں سر جان الکاک اور ٹھین براون نے بحر اٹلانٹک پر پہلا سفر کیا۔ ان لوگوں نے پہلی بار ۱۹۱۹ء میں نیو فاونڈ لینڈ سے آئرلینڈ تک مسلسل پرواز کی۔ یعنی بیچ میں کہیں رُکے یا اُترے نہیں۔

لڑائی کے زمانے میں ہوائی جہاز زیادہ تر لکڑی کے بنائے جاتے تھے لیکن لکڑی کی کمیابی کی وجہ سے المونیم اور لوہے کے بنائے جانے لگے اور یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز بھی بننے لگے جن میں ایک یا دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں اور یہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ سکتے ہیں۔ ان کا اُڑانا اس قدر آسان ہے کہ ہر شخص آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ یہ جہاز ایک گیلن پٹرول میں ۱۸ میل جا سکتا ہے۔ دو آدمی اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس میں بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ بغیر رُکے ہوئے چار سو میل تک جا سکتا ہے۔ مشہور ہواباز ہربرٹ ہنکلر ایسے ہی چھوٹے سے ہوائی جہاز میں انگلستان سے آسٹریلیا تک ساڑھے پندرہ دن میں اُڑ کر گیا تھا۔

اب تک ہوائی جہاز کے اُڑنے اور اُترنے کے لئے ایک بڑے میدان کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اُڑتے وقت اور اُترتے وقت اسے دور تک دوڑنا پڑتا ہے۔ مگر اب ایک ہوائی جہاز ایسا بنا ہے جو زمین سے بغیر دوڑے ہی ہوا میں اُٹھ جاتا ہے اس کا نام آٹو جائرو۔ (AUTO.GYRO) اور ہیلی کوپٹر ہے۔

اسی سال کے شروع میں فلائنگ فلی کے نام سے ایک اور ہوائی جہاز تیار ہوا ہے۔ اس کا انجن بہت ہلکا ہوتا ہے۔ اس کا اڑانا بھی بڑا آسان ہے۔ یورپ میں تو بہت سے لوگوں نے اس کا ڈھانچہ خود ہی بنا کر انجن لگا لیا۔ ہندوستان میں بھی اس کا کافی رواج ہو رہا ہے۔

ہوائی جہازوں کی انعامی مقابلے کی دوڑیں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ لمبی ہو رہی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں لندن سے ملبورن تک ایک دوڑ ہوئی تھی فاصلہ گیارہ ہزار میل تھا اور اوّل آنے والے جہاز نے یہ فاصلہ دو دن ۲۲ گھنٹے ۵۹ منٹ ۵۰ سیکنڈ میں طے کیا۔ ایک اور ہوائی مقابلہ اس مضمون کے لکھتے وقت ہو رہا ہے یہ لندن سے جائسبرگ (جنوبی افریقہ) تک ہے۔ فاصلہ ۶۱۵۴ میل تھا۔ اس دوڑ میں اسکاٹ[1] اوّل رہا اور ۵۲ گھنٹے ۵۶ منٹ ۴۸ سیکنڈ میں یہ فاصلہ طے کیا۔ ہوائی جہاز کی رفتار کا اوسط ۱۲۳ میل فی گھنٹہ رہا۔

آج کل دور کی مسافت کے لئے فلائنگ بوٹ کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اس میں پہیے نہیں ہوتے اور پانی میں اُترتا ہے۔ لندن سے آسٹریلیا تک کے لئے کوئی اٹھارہ فلائنگ بوٹ تیار کئے گئے ہیں۔ یہ ہندوستان سے ہو کر گزریں گے

[1] لندن سے ملبورن کی دوڑ میں بھی یہی اوّل آیا تھا۔

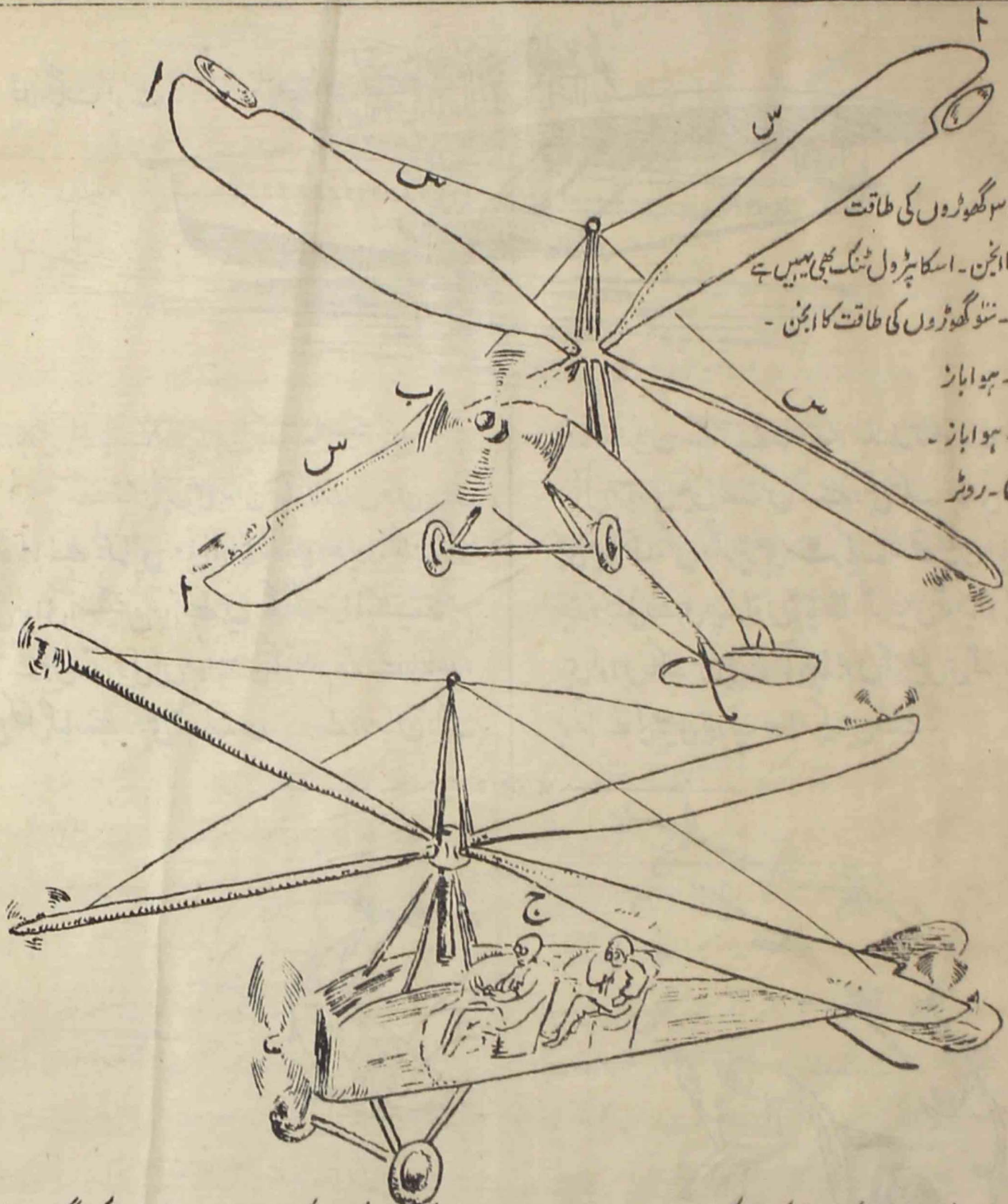

ا۔ ۱۳۰ گھوڑوں کی طاقت کا انجن۔ اسکا پٹرول ٹنک بھی یہیں ہے

ب۔ ننو گھوڑوں کی طاقت کا انجن۔

ج۔ ہوا باز

د۔ ہوا باز۔

س۔ روٹر

یہ غیر معمولی ہوائی جہاز بل کوجائر کہلاتا ہے۔ اس میں علاوہ معمولی سامنے کے انجن کے اوپر کی طرف چار بہت لمبے لمبے پنکھے لگے ہیں ان کو روٹر Rotor کہتے ہیں۔ اور ہر روٹر کے سرے پر ایک اور چھوٹا سا انجن لگا ہے جس سے ایک پنکھا گھومتا ہے۔ چاروں روٹر اور ان کے پنکھوں کے گھومنے سے یہ ہوائی جہاز ہوا میں قایم رہتا ہے۔ یہ زمین سے سیدھا بغیر دوڑے ہوئے ہوا میں اُٹھ جاتا اور اسی طرح نیچے اُتر آتا ہے۔ اور نئے سیکھنے والے کے لئے اس پر قابو رکھنا بہت آسان ہے۔

فلائنگ بوٹ

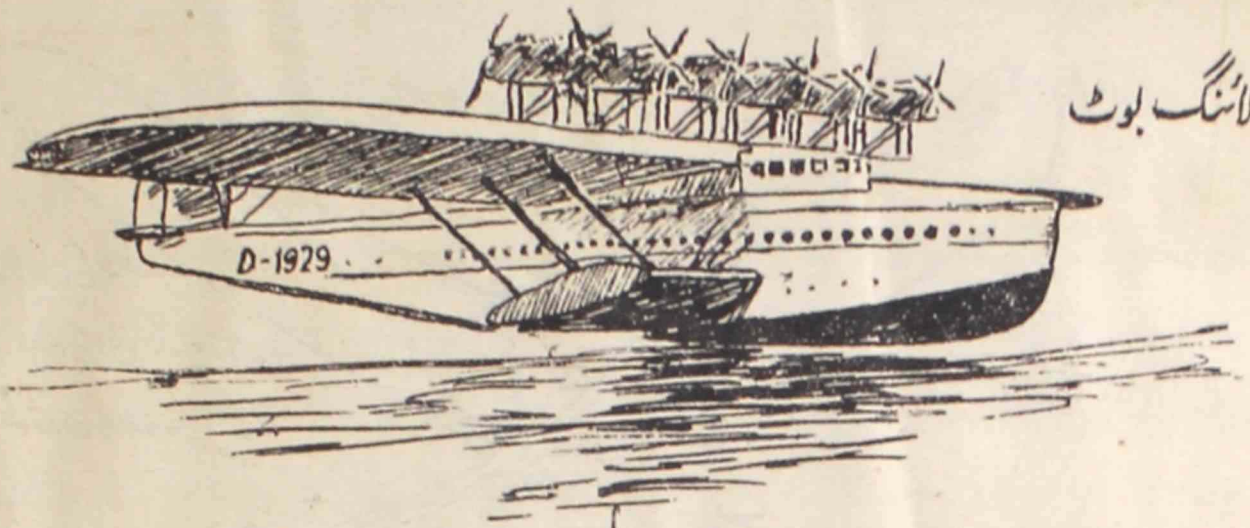

الہ آباد میں دریائے گنگا پر اس کے لئے اسٹیشن بن رہا ہے

ہندوستان میں بھی ہوائی جہاز کا رواج دن پر دن بڑھ رہا ہے۔ کراچی، دہلی، الہ آباد، جودھپور، کلکتہ، رنگون میں ہوائی اسٹیشن بن چکے ہیں۔ جگہ جگہ ہوائی کلب قایم ہو گئے ہیں۔ نئی دہلی میں ہوابازی کی تعلیم کے لئے باقاعدہ کالج کھل گیا ہے۔ دہلی اور لندن کے درمیان ڈاک اور مسافروں کے آنے جانے کا سلسلہ قایم ہے اسی سال فروری میں مدراس سے دہلی تک ہوائی مقابلہ بھی ہوا تھا۔ کئی انگریز بھی شریک تھے لیکن ایک ہندوستانی مصری چند اوّل آیا تھا۔ اگر یہی توجہ اور دلچسپی رہی تو اس ملک میں بھی ہوائی جہازوں کی ایسی ہی کثرت ہو جائے گی جیسی یورپ اور امریکہ میں ہے۔

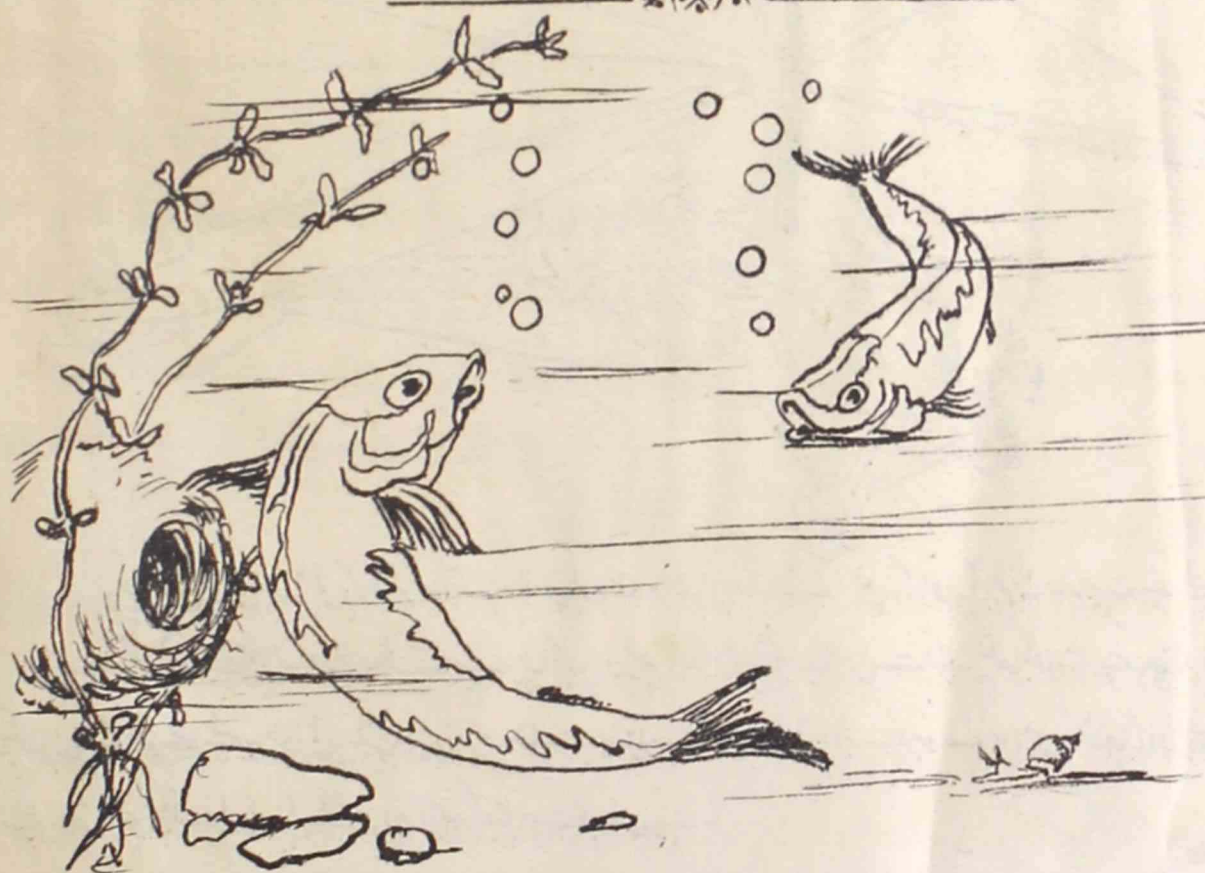

ریگستان کی لڑائی

ہاجرہ بیگم صاحبہ

محترمہ ہاجرہ بیگم کی ایک بڑی اچھی کہانی یا نقل تم پیام تعلیم میں پڑھ چکے ہو۔ اب انھوں نے یہ دلچسپ اور مفید مضمون بھیجا ہے۔ امید ہے کہ تم اسے دلچسپی سے پڑھو گے۔ ہاجرہ بیگم صاحبہ نے وعدہ کیا ہے کہ پیام بھائیوں نے اُن کے مضمون پسند کئے تو ہر مہینے وہ پیام تعلیم کے لئے ایسے ہی اچھے اچھے مضمون بھیجتی رہیں گی۔ ایڈیٹر

ریگستان تو تم جانتے ہی ہو۔ اس جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں ریت ہی ریت ہوتا ہے اور کچھ اُگتا نہیں۔ ایسی ریتیلی جگہ ہمیشہ ویران ہی رہتی ہے۔ کھیتی باڑی تو خیر وہاں کر ہی نہیں سکتے۔ اور دوسرے کام کرنا چاہیں۔ مثلاً زمین سے تیل یا دھاتیں نکالنا یا کارخانوں میں چیزیں بنانا تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ پانی نہ ہونے سے وہاں انسان کا رہنا بسنا ہی ناممکن ہے۔

قارا قم کا صحرا بھی ایسی ہی ریتیلی جگہ ہے آج اس کی کہانی تمھیں سناتے ہیں۔ ذرا اپنی اٹلس اُٹھالاؤ۔ مگر بھائی اسے جغرافیے کا سبق نہ سمجھ لینا۔ ہم تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ کہانی ہے اور مزے دار۔ اچھا تو نقشے میں دیکھو۔ ہندوستان کے پاس ہی شمال کی طرف تمھیں روس کے علاقے میں یہ صحرا ملے گا۔ مل گیا نا؟

دیکھو اس ریگستان میں ایک دریا ہے۔ امو دریا یا دریائے جیحوں۔ جو بحر ارال میں جا گرتا ہے۔ پہلے تو یہ جگہ ویران ہی تھی۔ لیکن اب دریا کی وجہ سے کچھ آباد ہو گئی ہے۔ اس کے کنارے کنارے لوگ رہنے بسنے لگے ہیں۔ بڑے بڑے شہر اور گانوں بھی یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ہری بھری کھیتیاں۔ بڑے بڑے باغ میلوں تک نظر آتے ہیں۔

اسی طرح صحرائے قزل قم کے بیچوں بیچ بخارا کا نخلستان ہے۔ یہاں کا حال تم نے پرانے قصے کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ سرسبز و شاداب ایک جزیرہ ساریت کے سمندر میں تھا۔ جہاں ہر طرح کا میوہ، پھل پھول، اناج، غرض سبھی کچھ پیدا ہوتا تھا۔

لیکن آج کل صحرائے قزل قم اور صحرائے قارا قم دونوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ لڑائی انسانوں میں نہیں۔ حیوانوں میں نہیں بلکہ ریگستان اور سرسبز شاداب زمین میں ہے۔ اب تم ضرور چونکے ہوگے کہ ریگستان تو ریت ہے۔ ریت کیسے لڑتا ہے؟

سنو۔ تم ہی نہیں بلکہ پہلے چھوٹے بڑے سب ہی سمجھا کرتے تھے کہ ریت ریگستان میں ہے۔ اور ریگستان کی جو حد ہے اسی میں رہے گا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ریت ایک جگہ ٹھہرنے والی چیز نہیں۔ بلکہ اپنی حدوں سے آگے بھی بڑھتی اور پیچھے بھی ہٹتی ہے۔

یہ کیسے؟

کبھی راجپوتانہ یا سندھ گئے ہو؟ اگر گئے ہوگے تو ضرور دیکھا ہوگا کہ ہوا کی طرح ریت بھی بگولے بن کر اُٹھتا اور تیزی کے ساتھ یہاں سے وہاں پہنچ جاتا ہے۔

جس جگہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یعنی روسی ترکستان کے صحراؤں میں تو یہ حال ہے کہ بگولے تو کیا۔ دیوار کی دیوار اور پہاڑ کا پہاڑ ریت کا اُٹھ کر آتا ہے اور میلوں چلا جاتا ہے۔ کچھ سمجھے کہ یہ کیسی خوفناک چیز ہے؟ ذرا سی آندھی تمھارے یہاں آتی ہے تو کیسی ہل چل مچ جاتی ہے۔ لوگ گھبرا کر مکانوں میں گھستے ہیں۔ دروازے بند کر لیتے

ہیں۔ پھر بھی ہر چیز مٹی سے ڈھک جاتی اور غبار آلود ہو جاتی ہے۔ پھر جب تھوڑی سی مٹی کے بجائے لاکھوں، کروروں من ریت ہوگا تو کیا ہوگا؟ اس ریت کے پہاڑ کے راستے میں جو کچھ آتا ہے وہ بالکل دب جاتا ہے۔ انسان اور حیوان تو پہلے ہی دم گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ درخت بوجھ سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور کھیت دب کر برباد ہو جاتے ہیں۔ درخت اور انسان کیا چیز ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں دفن ہو جاتی ہیں۔ اس منوں ریت کو کون اٹھا سکتا ہے؟ کبھی ہوا ہی کے زور سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے۔

پچھلے سالوں میں یہ بات معلوم ہوئی کہ قراقم کی ریت آہستہ آہستہ دریا کے کناروں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دو سو میل تک برابر لوگ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ مگر ریگستان کی ریت ہے کہ اُن کے کپاس کے کھیتوں، انگوروں کی بیلوں اور میوے کے باغوں پر قبضہ کرتا جاتا ہے۔

یہی حال قزل قم کا ہے۔ چالیس میل کی بخارا کی سرحد پیچھے ہٹائی جا رہی ہے۔ قراقل کا نخلستان تو قریب قریب تمام ہی ریت کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔ بس یہی ریت کا دھاوا ہے! اور بھی لڑائی!!

اگر بخارا اور قراقل کے رہنے والوں کو اپنی جان بچانا ہے اور اپنی روزی کی فکر کرنا ہے تو اُن کو ریت کے اس حملے کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ ریگستان کی لڑائی ہے۔ اور کیسی لڑائی! بغیر تلوار کے بغیر بندوق کے۔ لیکن جان توڑ لڑائی بلا

تو پھر یہ لوگ کیسے مقابلہ کرتے ہیں؟

چالیس چالیس فٹ اونچی ریت کی لہر اُن پر چڑھتی ہے۔ گھر اور درخت سب دب جاتے ہیں۔ سب سے پہلے نباتی کے پیڑ برباد ہوتے ہیں۔ جہاں اُن کے تنوں تک ریت آیا اور وہ سوکھے کر اگاچ کا پیڑ البتہ ذرا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن کہاں تک آخر وہ بھی سوکھ جاتا ہے اور جہاں باغ تھے وہاں صرف ٹھونٹھ رہ جاتے ہیں۔

لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگتے ہیں اور نیا گاؤں بساتے ہیں۔ لیکن ریگستان پیچھا کئے جاتا ہے۔ اور پھر ان کو بھاگنے پر مجبور کرتا ہے۔ بعض جگہ لوگوں نے مٹی کی دیواریں ریت کی روک کے لئے بنائیں۔ اب باقاعدہ محاصرہ شروع ہوا۔ ریت دیوار کے باہر اور گاؤں والے اندر۔ لیکن ریت بڑھتے بڑھتے دیوار کے برابر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک جھونکے سے اندر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اندر والے جلدی جلدی دیوار کو اونچا کرتے ہیں لیکن کہاں تک؟ آخر دیوار بوجھ نہ سہار سکتی اور ٹوٹ جاتی اور پھر ریت کو کوئی نہ روک سکتا۔

اب لوگ سمجھے کہ کوئی نئی ترکیب سوچنا چاہیئے

پہلے انھوں نے اس بات پر غور کیا کہ ریت کیوں ہلتا ہے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بیچوں بیچ ریگستان میں ریت ایک ہی جگہ پڑا رہتا ہے۔ صحرائی گھاس اور پودوں کی جڑیں اس کو باندھے رکھتی ہیں اور ہلنے نہیں دیتیں۔ لیکن جہاں کہیں لوگ رہنے بسنے لگے ہیں۔ کنوؤں اور کھیتوں کے پاس جہاں مویشی چلتے پھرتے ہیں۔ وہاں کا ریت ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

اب بات کی جڑ کو پہنچ گئے۔

لوگوں نے خود اپنے دشمن یعنی ریت کو آزاد کیا۔ اُس کی زنجیریں۔ توڑ دیں اور قید سے نکال دیا۔ بات یہ ہے کہ سینکڑوں سال پہلے ریگستان تو تھا ہی۔ لیکن اس کا ریت جم گیا تھا۔ اور جگہ جگہ تھوڑی تھوڑی گھاس پھیل گئی تھی۔ اس گھاس کی جڑیں بالکل جال کی طرح ریت کو پھانسے ہوئے تھیں۔ نخلستان کے رہنے والے خرگی اپنے مویشیوں کے گلے لے کر یہاں آتے اور جب ایک جگہ

کی گھاس کم پڑنے لگتی تو دوسری چراگاہ ڈھونڈھ لیتے۔ ان دنوں ملک کی کمی نہ تھی۔ سب جگہیں کھلی تھیں۔ خرگی گڈریے اس بات کو سمجھتے تھے کہ ایک سال میں اتنی ہی گھاس لینا چاہئے کہ دوسری سال اُگنے کے لئے اس کی جڑیں اور ڈنٹھل باقی رہ جائیں۔ اسی لئے وہ ہر سال نئی چراگاہ ڈھونڈھتے تھے اور ایک ہی جگہ پر گذر کرتے تھے۔

جہاں گھاس پھیل جاتی تھی وہاں جھاڑیاں اور صحرائی درخت بھی پیدا ہو جاتے۔ ان صحرائی پودوں کی یہ خاصیت ہے کہ اُن کی جڑیں بہت لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ اور اس لئے گزوں نیچے جاکر پانی کے اندرونی مسوتوں سے نمی کھینچ لیتی ہیں۔ ان کی پتیاں بھی اور پتیوں کی طرح نہیں ہوتیں۔ بلکہ سوکھی سوکھی اور سخت کانٹے کی طرح ہوتی ہیں۔ اور نمی کو باہر جانے سے روکتی ہیں۔ اس طرح کا پودا "ناگ پھنی" تم نے سڑک کے کنارے کنارے اگتا دیکھا ہوگا۔

اس ملک میں خرگی مزے سے رہتے تھے کہ شمال سے روسی شہنشاہ کی فوجیں لوٹ مار کو نکلیں۔ نہ صرف انھوں نے خرگیوں کی مال و دولت لوٹی بلکہ جہاں کہیں اُن کو پایا قبیلے کے قبیلے کو قتل کر دیا۔ خرگی ان شہنشاہی ڈاکوؤں کے ڈر سے پیچھے یعنی جنوب کو ہٹتے چلے گئے۔ اب اُن کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی کہ وہ شمال کی چراگاہوں تک جائیں۔ لہٰذا جو قریب قریب صحرا کے اندر گھاس پھوس تھی اس پر گذر بسر کرنے لگے۔ جگہ اب چونکہ کم ہوتی جاتی تھی اس لئے اوپر اوپر کی گھاس تو کیا ڈنٹھل اور جڑیں تک سب نوچ کھسوٹ کر جانور کھا لیتے تھے۔ جھاڑیاں اونٹوں کے حصے میں آئیں اور درخت خرگی کاٹ کر اپنے خیمے کے ڈنڈے بناتے اور ایندھن کے کام میں لاتے۔

نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک سال کے بعد پھر سبزہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ جڑیں سوکھ جاتیں۔ ریت آزاد ہو جاتا اور پھر چراگاہ کی جگہ ویران صحرا رہ جاتا۔

دوسرے جا ہوا ریت گلّوں کے ادھر ادھر گھومنے سے اُن کے کھروں سے بالکل اکھڑ جاتا اور ذرا سی ہوا سے بھی فوراً اُڑنے لگتا۔

روس میں شہنشاہوں کے بعد اب سوویٹ حکومت قائم ہوئی لوگوں نے دیکھا کہ شہنشاہی فوجوں کے بجائے وہی ریت جس کو انھوں نے آزاد کیا ہے۔ اُن کا دشمن بن کر اُن پر حملہ کرتا ہے۔

چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ اگر ریت کو کوئی نہ چھیڑے تو وہ خود بخود اس کے روک کی ترکیب ہو جاتی ہے دو ریت کے ٹیلوں کے بیچ میں جہاں ذرا سی بھی محفوظ جگہ ہوئی کہ گھاس اگنا شروع ہو گئی اس گھاس کا بڑھنا ہے تو مشکل کیوں کہ اول تو بیج ہی ہوا سے بکھر کر دب جاتے ہیں اور جمنے نہیں پاتے۔ اور اگر کہیں جم بھی جاؤیں تو ایک لہر ریت کی آئی اور دب گئے۔ اور یہ تو خطرہ ہمیشہ ہی ہے کہ کسی وقت آندھی آئے اور ننھے پودے جڑ سمیت اُکھاڑ پھینکے۔ پھر وہ ریت پر پڑا سوکھا کرے۔

خیر باوجود ہزار دشواریوں کے گھاس اگنے ہی لگتی ہے۔

سب سے پہلا پودا جو ہمت کر کے اگنا شروع کرتا ہے وہ قندیم کہلاتا ہے۔ یہ قندیم بھی بڑا ہی چالاک پودا ہے۔ اور پودوں کی طرح قدم قدم نہیں بڑھتا بلکہ اچھلتا کودتا آگے دوڑتا ہے۔ وہ ایسے کہ قندیم کے بیج ایک چھوٹے سے اخروٹ میں ہوتے ہیں۔ اور اسی اخروٹ کی سخت بکل کے اوپر باریک باریک بال ہوتے ہیں۔ جب ہوا چلتی ہے تو یہ بال پروں کا کام دیتے ہیں اور جیسے ننھی ننھی بڑھیاں ہوا میں اُڑتی تم نے دیکھی ہیں اسی طرح یہ بیج بھی ہوا کے ساتھ اُڑ کر گیند کی طرح آگے جاگرتے ہیں۔ ہوا کے ساتھ ریت بھی اُڑتا ہے۔ لیکن

بھاری ہے۔ اس لئے پیچھے رہ جاتا ہے اور بیج کو دبانے نہیں پاتا۔

خیر یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن جب بیج جم گیا اور پودا اُگنے لگا تو کیا ہوگا۔ پودا تو اچھل کود نہیں سکتا۔ ریت کی لہر آئی اور ناشپاتی آڑو کے پودوں کی طرح یہ بھی دب گیا۔ لیکن سنو تو یہ قندیم صاحب ایسے بے وقوف تھوڑا ہی ہیں نہ تو اس کی پتیاں ہوتی ہیں اور نہ تنا بلکہ جھاڑو کی سینکوں کی طرح پتلی پتلی سینکوں کی ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ جب ریت کا ریلا آتا ہے تو قندیم صاحب بجائے اکڑ کر اس کا مقابلہ کرنے کے اپنی سینکیں پھیلا دیتے ہیں اور ریت بیچ میں سے چھن چھن کر نکل جاتا ہے۔

لیکن ساری مشکلیں کہاں آسان ہوئیں بعض دفعہ بہت بڑی بڑی لہریں آتی ہیں اور قندیم میاں کو دبا ہی لیتی ہیں بیچارہ بالکل دفن ہو جاتا ہے۔ لیکن ہے خوب چیز ہمت نہیں ہارتا۔ اور جتنا ڈھکتا جاتا ہے اتنا ہی اور اوپر کو بڑھتا جاتا ہے۔ آخر کار ہوا گذر جانے کے بعد ریت تو بے جان ہو کر پڑ جاتا ہے اور قندیم برابر بڑھتے بڑھتے بازی جیت جاتا ہے اور اپنا سر باہر نکال لیتا ہے یہی نہیں کہ قندیم اوپر ہی کو بڑھے بلکہ وہ ریت کے نیچے نیچے بھی پھیلتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایک روز گذر جاتے ہیں تو ہزاروں ننھی ننھی سینکیں ریت کے ٹیلے پر نظر آنے لگتی ہیں۔

تم نے دیکھا؟ ریت کی موجودگی ہی سے قندیم اتنے اونچے پر جا کر پھیلا کہ چھوٹے موٹے ہوا کے جھونکے ریت کو وہاں تک پہنچا ہی نہیں سکتے۔

ایک خطرہ باقی تھا کہ ہوا تیزی سے چل کر ٹیلے کا ریت ہٹا دے اور قندیم کی جڑیں ننگی رہ جائیں اور دھوپ میں سوکھ جائیں۔ لیکن قندیم اس کی ترکیب بھی جانتا ہے۔ سر اوپر نکالتے ہی وہ اوپر کو بڑھنے کی بجائے نیچے ہی نیچے باریک باریک جڑوں کا جال تاننا شروع کر دیتا ہے۔ اس سے ایک تو نمی کے کھینچنے میں آسانی ہوتی ہے اور دوسرے اس کا دشمن ریت بالکل جکڑ جاتا اور اس کے قبضے میں آجاتا ہے اور ہل نہیں سکتا۔

اب جہاں زمین تیار ہوئی کہ طرح طرح کی گھاس نے اگنا شروع کر دیا۔ اور ریت کا ٹیلا ہری بھری چراگاہ ہو گیا۔ جہاں طرح طرح کی جھاڑیاں اور پیڑ بھی پیدا ہو گئے۔ لیکن اس میں ایک طرح کا نقصان بھی ہے۔ کچھ گھاسیں ایسی ہوتی ہیں کہ اوپر ہی اوپر پھیلتی ہیں اُن کی جڑیں نیچے تک نہیں جاتیں بلکہ اپنی خوراک آس پاس کے پودوں کی جڑوں سے کھینچ لیتی ہیں قندیم اور اُس کے ساتھیوں کو . . . . . .

. . . اس بات کی عادت نہیں ہوتی کہ خوراک بانٹیں لہذا وہ مرجھا جاتے ہیں۔ اُن کی جڑیں سوکھ جاتی ہیں اور نیچے کا ریت ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔

اب ذرا بات صاف ہو گئی۔ سوئٹ کے لوگوں نے جب اتنا سمجھ لیا تو وہ اپنی لڑائی میں جیتنے لگے۔ صحرا کے درخت کاٹنا بند کر دئے۔ صرف سوکھی اور بے کار ٹہنیاں کاٹی جاتی ہیں۔ اور جڑوں کو نقصان نہیں پہنچتا۔ مویشیوں کو گھاس برباد کرنے نہیں دیتے۔ بلکہ چراگاہ قائم رکھی جاتی ہے۔ اور وہاں جو خراب قسم کی گھاس آجاتی ہے۔ اس کو فوراً نکال دیا جاتا ہے۔ جن جگہوں پر ریت کا قبضہ ہو گیا ہے وہاں ہوائی جہاز بھیجے جاتے ہیں۔ جو گھاس کے بیجوں کی بارش کرتے ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس لڑائی میں ہوا سے بھی مدد لیتے ہیں۔ تم جانتے ہو ہوا ایک ہی رخ نہیں چلتی بلکہ کبھی صحرا سے شاداب زمین کی طرف اور کبھی شاداب زمین سے صحرا کی طرف چلتی ہے۔ جب ہوا موافق ہوتی ہے یعنی ریت کو صحرا کی

طرف اُڑا کر لے جاتی ہے تو اس کی روک نہیں ہوتی لیکن جونہی ہوا کے پلٹنے کا وقت آتا ہے تو فوراً ریت کے کنارے کنارے دیواریں اور باڑیں بنادی جاتی ہیں اور یہاں کھیت اور باغات شروع کر دئے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر مرتبہ تھوڑی تھوڑی زمین واپس مل جاتی ہے۔

یہ سب کام الگ الگ ایک ایک آدمی کے کرنے کے تو نہ تھے۔ اس کے لئے سب کی مدد اور سب کی سمجھ کی ضرورت تھی سوئٹ کے لوگ یہ باتیں خوب سمجھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے روسی ترکستان میں بڑے بڑے اسکول اور کالج بنادئے ہیں۔ جہاں لوگ ان سب مشکل مشکل باتوں پر غور کریں۔ خرگیوں کے لئے جو گرمی جاڑے چارے کی تلاش میں میلوں مارے مارے پھرتے تھے۔ رہنے کو مکان اور کاشت کرنے کو باغات اور کھیت بنا دئے گئے۔ اُن کے مویشیوں کے لئے معقول انتظام ہے پانی بھی اُن کو ملتا ہے اور چارا بھی گرمیوں میں جاڑے کے لئے کاٹ کر اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ ریگستان کے جاہل لوگ اب صحرا سے مشینوں اور بجلی کے ذریعے سے تیل اور گندھک نکالتے ہیں۔ کارخانوں میں اپنی ضرورت کی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ اور دن بدن ہر طرح سے ترقی کر رہے ہیں۔ اس طرح اپنے پھلے پھولے ملک کو نہ وہ صرف دوبارہ سرسبز شاداب بنا رہے ہیں بلکہ ہر طرح سے وہاں رہنے کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

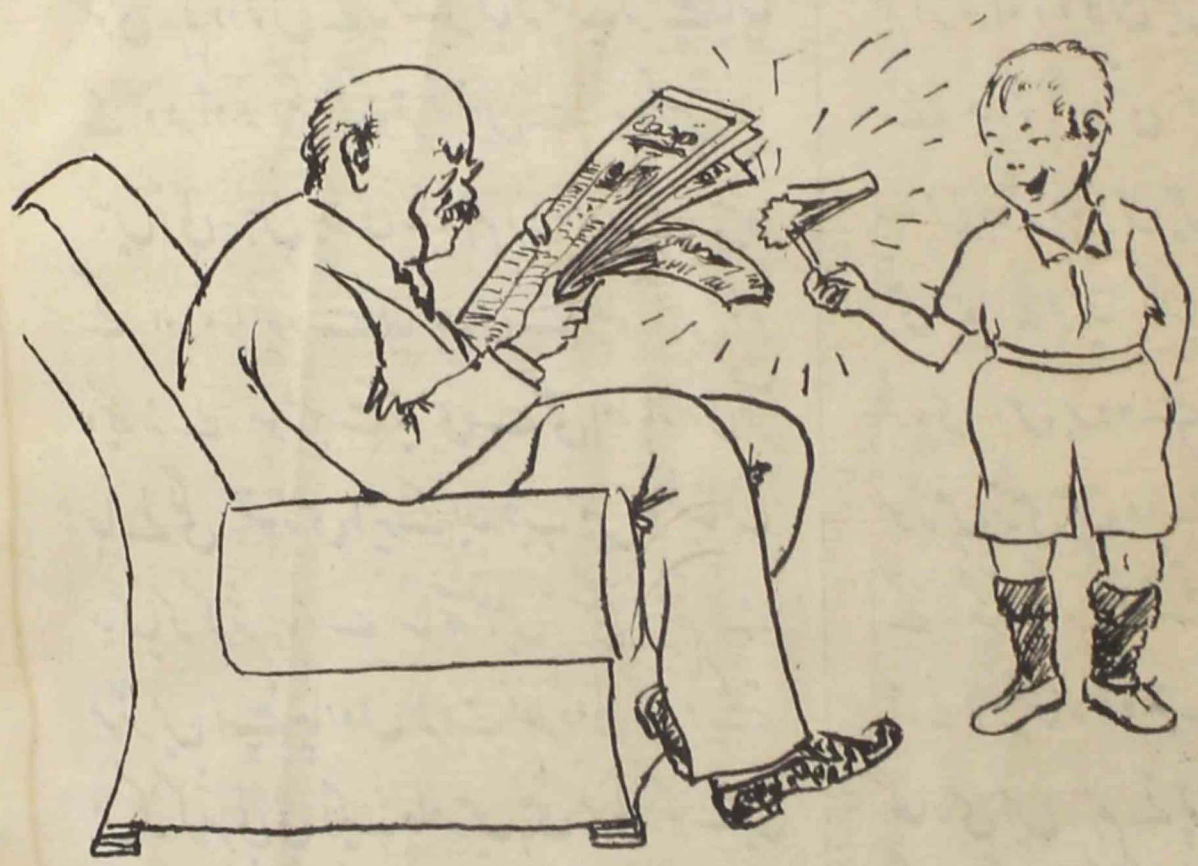

کوثر اور ناصر کی شرارتیں

عزیزہ ثریا بنت زاہد حسین

کوثر میری چھوٹی بہن ہے۔ بہت شریر ہم جو کام بھی کریں وہ اس میں حصہ لینا چاہتی ہے ایک دفعہ میں اور میرا چھوٹا بھائی ساجد بازار جاکر کچھ خریدنا چاہتے تھے۔ کوثر کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ اسے نہ جانے کیسے ہمارے ارادے کی خبر ہوگئی۔ ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چھپ کر چلے جائیں گے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوثر تو نہیں ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ بس جلدی سے ہم اپنی موٹر میں بیٹھ گئے۔ اور ڈرائیور سے کہا جلدی سے چلو۔ کہیں وہ دیکھ نہ لے۔ موٹر بہت تیزی سے نکلی اور بازار کی طرف جانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہمیں اطمینان ہوگیا کہ کوثر ہمارے ساتھ نہیں آسکی تو ہم نے موٹر میں اپنے چاروں طرف نظر ڈالی کیا دیکھتے ہیں کہ کوثر بی بی ایک چادر میں لپٹی ہوئی کونے میں بیٹھی ہیں۔ ہمیں بہت تکلیف ہوئی اور غصہ بھی آیا کیا کرسکتے تھے۔ اس کو بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ خیر اب تو آگئی ہو لیکن خبردار کوئی چیز مت خریدنا اس نے وعدہ کیا اور بہت اطمینان کے ساتھ ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ بازار پہنچے۔ دُکان پر موٹر کھڑی کی اور کوثر سے کہا موٹر سے مت اُترنا وہ چپکی رہی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم اُتر کر اندر دُکان میں گئے۔ اور سامان خریدنے لگے۔ بھیڑ زیادہ تھی۔ جب ہم خرید چکے تو دکان دار نے بِل بنا کر دیا اس میں ایک پیکٹ چاکلیٹ بھی تھی۔ ہم نے پوچھا یہ کیا لکھا ہے۔ ہم نے تو نہیں خریدی۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ کی چھوٹی بہن جو موٹر میں بیٹھی ہیں وہ لے گئی ہیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ پیسے دے کر موٹر میں آئے تو دیکھا کہ وہ مزے مزے سے چاکلیٹ کھا رہی ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا کیا تو کہنے لگیں اکیلے بیٹھے تھے کیا کرتے۔

ناصر میاں جو دو سال کے ہیں وہ اِن سے بھی بڑھ کر ہیں۔ جب ہم سب کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو وہ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور میز پر نظر دوڑاتے ہیں کہ کیا کیا کھانے ہیں پھر سب تھوڑے تھوڑے اپنی پلیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اور روٹی کو چاول سے کھانے لگتے ہیں۔ کرسی پر خاموشی سے بیٹھا نہیں جاتا اِدھر اُدھر ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ اسی طرح ہل رہے تھے کرسی اُلٹ گئی خود نیچے اور کرسی اوپر۔ بُری طرح چیخنا شروع کر دیا۔ اِن کو نکالا گیا پھر کھانے لگے کھاتے کھاتے آپ کو نیند بھی آجاتی ہے اور بیٹھے بیٹھے سونا شروع کر دیتے ہیں۔ غرض کھانا کھانا اُن کے لئے بہت بڑا کام ہے اگر کوئی کچھ کھاتا ہو چاہتے ہیں یہ بھی ہی کھائیں یہاں تک کہ دوا بھی کوئی پیتا ہو تو وہ بھی مانگتے ہیں ایک مرتبہ اماں جان کے ہاتھ میں کونین کی شیشی تھی وہ مانگنے لگے اُنھوں نے پوچھا کھاؤ گے تو کہا ہاں اُنھوں نے ایک گولی نکال کر اُن کے منہ میں رکھ دی۔ اُس وقت اُن کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ تھوکتے پھرتے تھے۔ اس کے بعد سے یہ تو ہو گیا کہ دواؤں میں حصّہ نہیں لگاتے۔

معلومات

امریکہ کے ایک اخبار نویس نے ایک لڑکی کا حال دریافت کیا ہے جس کی آنکھیں بالکل کالی ہیں اور بال بالکل سفید۔

ہنگری کے ایک میاں اور اُن کی بیوی امریکہ کی سیر کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔ میاں کی عمر ۱۰۵ اور بیوی کی ۱۰۰ سال ہے۔ انھوں نے حال ہی میں اپنی شادی کی پچھترویں سال گرہ منائی تھی۔

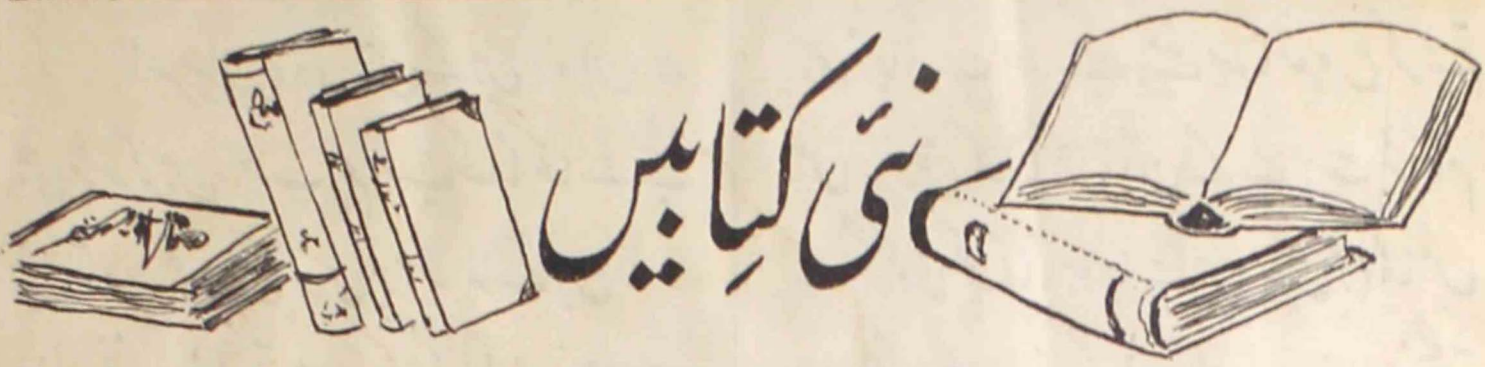

نئی کتابیں

تازہ مضامین

یہ جناب ماشاءاللہ خاں صاحب جلیسری منشی وکامل ایل، ای، اے، یو کے تازہ مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں انھوں نے بہت تفصیل سے بتایا ہے کہ مضمون کیسے لکھنا چاہیے اور مضمون لکھتے وقت کن کن باتوں کا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے اس کے بعد خود ہی بہت سے مضمون لکھے ہیں اور گویا اپنی بتائی ہوئی باتوں پر خود ہی عمل کر کے بتایا ہے۔ یعنی مضمون ایسے لکھا جاتا ہے اور لکھتے وقت اس طرح تمام باتوں کا خیال رکھتے ہیں پھر یہ کہ جتنے مضمون اس مجموعے میں ہیں سب امتحانوں میں آچکے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ بار بار آئیں۔ مضمون ہر طرح اور ہر قسم کے ہیں۔ کتاب ساتویں، آٹھویں درجے کے لڑکوں کے لئے مفید ہے اور ان ہی کے لئے لکھی گئی ہے۔ کتاب ۱۲۴ صفحوں کی ہے۔ لکھائی چھپائی اوسط درجے کی۔ کاغذ سفید، قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:۔ ماشاءاللہ خاں جلیسری۔ کمبل کٹرہ۔ آگرہ

بچوں کی تاریخ اسلام

منشی عبدالرحمٰن صاحب ناطق نے بچوں کے لئے اسلام کی تاریخ لکھی ہے۔ ہمارے سامنے اس کا پہلا حصہ ہے۔ شروع میں آں حضرتؐ کے حالات ذرا کھول کر بیان کئے ہیں پھر امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے مختصر حالات ہیں۔ کتاب کی زبان سہل اور سادہ ہے۔ اور دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے۔ موقع موقع سے عرب اور خلفائے راشدین کے زمانے کی اسلامی حکومتوں کے نقشے بھی دئے گئے ہیں۔ اس سے کتاب اور بھی مفید ہوگئی ہے

کتاب ۸۰ صفحے کی ہے لکھائی۔ چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت دو آنے۔ ۲ر

ملنے کا پتہ اختر بک ڈپو۔ بمبئی نمبر ۳

جوجو

جناب اظہر علی صاحب فاروقی لکچرر اردو پرتاب کالج بنارس

لکھنؤ کے میڈیکل کالج سے ایک سڑک تحاس کو جاتی ہے۔ اس کا نام ہے وکٹوریہ اسٹریٹ اس سڑک پر ایک عالی شان مکان ہے۔ اس مکان سے یوں تو اکثر تو تو، میں میں، شور وغل کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور ہر گذرنے والے کے لئے تفریح کا سامان پیش کرتی ہیں۔ لیکن آج ایک عجیب ڈروانی آواز آرہی ہے۔

"کیسا ہضم کرلیا مردے نے باپ کا سامال! آخر یہ کل موئی کہاں گئی؟"

ایک بیگم صاحبہ غصے میں آپے سے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھیں۔ اُن کا نام تھا سلطان جہاں بیگم۔ کوئی چھتیس سینتیس سال کا سن ہوگا۔ اور موٹی ایسی جیسے سمجھ لو سنیما والی اندو بالا۔ نواڑ کے ایک کھٹولے پر بیٹھی تھیں۔ جو اُن کے بوجھ سے زمین بوسی کر رہا تھا۔ انھوں نے پاس کی چوکی پر رکھے ہوئے لوٹے کو اٹھایا۔ پانی کا ایک چھینٹا منہ پر دیا اور پھر چلانے لگیں۔ میں تو عاجز ہوں اس جنم جلی سے۔ وہ تو کہو میں ان کی وجہ سے کچھ بولتی نہیں ورنہ یہ گھر کے کام کاج کے قابل تھوڑی ہے۔ کھلا دیا نامردے کو۔ اب میرا بچہ کیا کھائے گا؟" ابھی بیگم صاحب کے غصے کی بوچھار ہو رہی تھی کہ رونے کی۔ اوں، اوں، ہوں، ہاں ..... کے ساتھ یہ لفظ سنائی دئے۔

"اَتھی[1] اماں! اب ہم تیا تھائیں گے۔ اس ہلام زادے نے ....." یہ تھے بیگم صاحبہ کے صاحب زادے۔ اُن کا نام تھا فصاحت حسین اور لاڈ میں سب پُتن میاں کہتے تھے۔ ان کی عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ کالے کلوٹے۔ چیچک کے داغوں نے اُن کے چہرے کو تبارک کی روٹی بنا دیا تھا۔ بے چارے "دیکسی نے ٹر" نے نہ جانے کتنی منتیں کیں خود میاں پتن کے ابا جان نے کتنی مرتبہ سمجھایا کہ ٹیکا اچھی چیز ہے۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ چیچک سے محفوظ رہنے کے لئے اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ مگر بیگم صاحب نے ایک نہ مانی جب "دیکسی نے ٹر" آیا اس کو واپس کر دیا۔ ایک دن اس نے ذرا ترش رو ہو کر سختی سے التجا کی اس پر بیگم صاحب نے ایک دس روپے کا نوٹ اور دو گلوریاں پان کی پیش کر دیں۔ "دیکسی نے ٹر" نے اسکول جانے والے ایک لڑکے کو دکھلایا نوٹ کتنے کا ہے

---

[1] اچھی اماں! اب ہم کیا کھائیں گے۔ اس حرام زادے نے۔

اس نے کہا دس روپے کا۔ یہ سن کر اُن کی باچھیں کھل گئیں نوٹ جیب میں رکھا اور گلوریاں منہ میں دبائیں اور اپنی راہ لی۔ گویا بیگم صاحب نے بھونکتے ہوئے کتے کے سامنے روٹی کا ایک ٹکڑا پھینک دیا اور اس کا منہ بند کر دیا۔

ہاں تو میاں پتن نے خیر سے تیرھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ لیکن زبان اب تک صاف نہ تھی۔ اگر باپ بے چارے ٹوکتے تو بیگم صاحبہ ان کا منہ نوچ لیتیں اور فرماتیں "اونہہ" ہندی کی مثل نہیں سُنی۔ مانک ٹیڑھے ہی بھلے، رہنے دو جب سیانا ہوگا۔ خود سمجھے گا۔ ہمارے تین ماموں تو کوئی بیس برس تک یوں ہی بولتے رہے اور اب دیکھئے تو ماشاء اللہ کیسے فراٹے بھرتے ہیں۔ ہاں صرف اتنی بات ہے کہ مواقاف اب تک نہیں نکلتا۔ اس کو تاف ہی کہتے ہیں۔ اور رے کو لے۔ اتنا کہہ کر بیگم صاحب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور بے چارے نواب صاحب چپ ہوگئے۔ غرض میاں پتن پر یہ مثل صادق آئی۔ "ایک تو کریلا کڑوا، دوسرے نیم چڑھا" ان کو انڈے کھانے کا بہت شوق تھا۔ اور آج شرفو کے لڑکے نے انڈا کھالیا تھا۔ اسی پر میاں پتن اور ان کی ماں نے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔

شرفو ایک شریف خاندان بیوی تھی۔ پڑھی لکھی عقل مند سلیقہ شعار۔ مگر تھی قسمت کی ہیٹی۔ ماں باپ کا پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ ایک شوہر کا سہارا تھا۔ وہ بھی چل بسا۔ اب وہ تھی اور اس کا ننھا مشرف، سچ ہے پیپری وقت اسی کو کہتے ہیں۔ چاروں طرف نظر دوڑاتی تھی، کوئی والی وارث دکھائی نہیں دیتا تھا۔ غریب دکھیا! طرح طرح کے خیالات دماغ میں پکاتی۔ کبھی وہ سوچتی کہ ٹوپیوں کے پلے بنا کر بیچوں۔ کبھی سوچتی تھی کہ سلائی کر لیا کروں گی۔....

.....

مگر ساتھ ہی اس خیال سے اس پر مایوسی چھا جاتی۔ کہ پلے اب کون پہنتا ہے۔ شیروانی پر تو لوگ اب ہیٹ لگانے لگے ہیں۔ سنگر مشین کے آگے سلائی کس کی چلے گی۔ آخرکار اس نے طے کیا۔ نواب شجاع قدر کی مغلانی سے مل کر کچھ طے کر دوں۔ مغلانی نے ایک مرتبہ اس سے کہا تھا کہ بیگم صاحب کو ایک..... کی ضرورت ہے

اس طرح بچاری شرفو ایک سیدزادی نے بیگم صاحب کی محل سرا میں قدم رکھا۔ بیگم صاحب نے نام پوچھا۔ تو اشرف بانو بتانے پر ناک بھوں سکوڑی اور کہنے لگیں "نا بہن اتنا لمبا نام کون لے گا اور پھر بیگم اور..... ..... میں کچھ فرق تو ہو۔ میں تو شرفو کہوں گی منظور ہے" وہاں انکار کی کس کو جرأت تھی۔ اور شرفو بی بی اب سیدانی کے بجائے باورچن ہے۔

"نا بیٹا! اسے نہ کھاؤ"

"نہیں اماں ہم بھی....."

مشرف علی ساڑھے تین سال کی جان، یتیم بچہ، ایک انڈے کے لئے اس طرح اپنی ماں شرفو سے کہہ رہا ہے اور وہ اس کو سمجھاتی ہے۔ لیکن بچہ پھر بچہ ہی ہے۔ وہ اپنے اور میاں پتن میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ اس کا دل صاف ہے اس کو اپنے آئینہ دل میں تمام شکلیں یکساں نظر آتی ہیں۔ وہ مہترانی کے لڑکے سے بھی چیز مانگتا ہے اور اس کو اپنی چیز دیتا ہے۔ وہ اس سے گلے لگ جاتا ہے۔ اس کے دماغ کا

کیمرہ جب کسی بچے کی تصویر کھینچتا ہے۔ تو اس میں وہی خط و خال نظر آتے ہیں جو میاں تین کے

"نا بیٹا اسے نہ چھوؤ۔ کاٹ لے گا"

"جوجو ہے اماں؟"

"ہاں، ہاں"

اتنا کہنے پر بھی وہ نہ مانا اور اس نے انڈا اٹھا ہی لیا۔

شرفو کو اس دن کی جھڑکیاں یاد تھیں اور کوسنے بھی۔ وہ اپنے لئے سب کچھ سن سکتی تھی۔ لیکن اپنے لال کے لئے نہیں۔ مشرف برابر "ہم بھی، ہم بھی" کرتا رہا۔ آخر شرفو جلبلا گئی اور اس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

"جوجو ہے بیٹا کاٹ لے گا" اتنا کہہ کر اس نے تلا ہوا گرم گرم انڈا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

مشرف بلبلا اٹھا۔ اور بیگم صاحب نے بڑبڑا کر کہا۔ بس بھئی توبہ بھلی۔ اس مردے سے۔ جب دیکھو جب چیخا کرتا ہے۔ نیند حرام کر دی موئے نے، ذری کی ذری آنکھ جھپک گئی تھی کہ چیخ اٹھا۔ میں باز آئی" اتنا کہہ کر اٹھیں اور اشرف کو دھننے لگیں۔ مغلانی بچاری دل میں کہنے لگیں "اُف! کیا واقعی ان امیروں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ کیا یہ اتنے بے حس ہوتے ہیں۔ انھیں کسی دوسرے کے درد کا احساس نہیں۔ کیا یہی وہ امیر عورتیں ہیں جو اولاد کے لئے دم دیتی ہیں۔ مگر دوسرے کی اولاد کو کچھ نہیں سمجھتیں"

غریب شرفو نے اپنے بچے ہی کی خاطر یہ مصیبت برداشت کی تھی۔ جب وہی بیگم صاحب کی آنکھوں میں خار ہے تو اس کا رہنا بالکل بے کار ہے۔ اس نے نہایت خندہ پیشانی سے اس گھر کو خیرباد کہا۔ لیکن وہ رہ رہ کر یہ ضرور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا واقعی بیگم صاحب اسی اسلام کی پیرو ہیں۔ جس نے یتیموں پر غصہ تک کرنے کو منع کیا ہے۔

"نہیں اماں۔ اب ہم نہیں کھائیں گے۔ وہ سچ مچ جوجو ہے۔ کاٹتا ہے۔ اماں! بیگم صاحب کے گھر سے چلو" ایک چھپر کے نیچے چارپائی پر لیٹا ہوا مشرف بڑبڑا رہا ہے اگرچہ اس کے لفظ صاف سمجھ میں نہیں آتے مگر وہ یہی کہہ رہا تھا۔ جلے ہوئے ہاتھ والے اور بخار میں بھلستے ہوئے مشرف سے ان باتوں کے علاوہ کسی دوسری بات کی امید رکھنا غلطی ہے۔

اشرف بانو نے کہا۔ "بیٹا تم اب وہاں نہیں ہو تم اپنے گھر میں ہو"

یہ سن کر مشرف نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ مگر بخار کی شدت نے نہ کھولنے دیں۔ اس نے لجاجت سے کہا۔

"اماں تم اب امیروں کے پاس پڑوس ہرگز نہ رہنا۔ اُن کے لڑکے بڑے بے رحم ہوتے ہیں"

"نہیں بیٹا! انھیں بے رحموں میں بڑے بڑے اللہ والے اور رحم دل بھی ہوتے ہیں"

"نا اماں! مجھے تو ان سے ڈر لگتا ہے۔ یہ تو جوجو ہیں۔ مارتے ہیں۔ کاٹتے ہیں"

تین دن تک مشرف کی یہی حالت رہی۔ وہ ہذیان میں اسی طرح بکتا رہا۔ اشرف بانو کے پاس پیسہ کہاں تھا۔ جو کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بلاتی۔ اس کا تو صرف خدا تھا۔ اور وہ بھی اس وقت نہ جانے اس سے ناخوش تھا یا خوش

بہرحال اس نے ایک دفعہ یہی کہا۔ مجھ سے تو خدا بھی خفا ہے" دعا کرتے کرتے زبان گھس گئی۔ آیتیں دم کرتے کرتے تھک گئی۔ چوتھے دن مشرف نے آنکھ کھولی اور کہا "اماں! انڈا کھائیں گے" پھر چیخ کر کہا "نہیں اماں جوجو"

اشرف بانو سے اب نہ رہا گیا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ اس نے حیا کا جامہ اتار پھینکا۔ جس طرح ہو سکا ایک انڈا حاصل کیا۔ اس کو تلا۔ ٹھنڈا کیا۔ نمک مرچ پیس کر رکھا اور نہایت پیار سے مشرف کو پکارا۔ "بٹیا! آنکھیں کھولو دیکھو ادھر دیکھو"

مشرف کو تیسرے پہر کو پھر نجاست نے آدبوچا اس کا جلا ہاتھ اچھا نہ ہوا۔ بیگم کے مارنے سے اس کے ماتھے میں چوٹ آگئی تھی۔ اس میں بلا کا درد تھا۔ اس نے آنکھ کھولنے کی کوشش کی ماں کی محبت بھری آواز کان میں آئی۔ اس کو سانس لینے میں تکلیف تھی۔ اور مشکل سے آتی جاتی تھی۔ اس کی سانس بہت تیزی سے پھولنے لگی۔ اشرف بانو نے پھر پکارا "بیٹا آنکھ کھولو۔ دیکھو" مشرف نے آنکھ کھولی اور انڈے کو دیکھا۔ پھر آہستہ کہنے کی کوشش کی "اماں! نہیں ..... جوجو ..... جوجو ..... جوجو" اور آنکھ بند کرلی۔"

اشرف بانو کے حواس باختہ ہوگئے اور وہ بھی جوجو ..... جوجو ..... چیخ کر بے ہوش ہوگئی۔

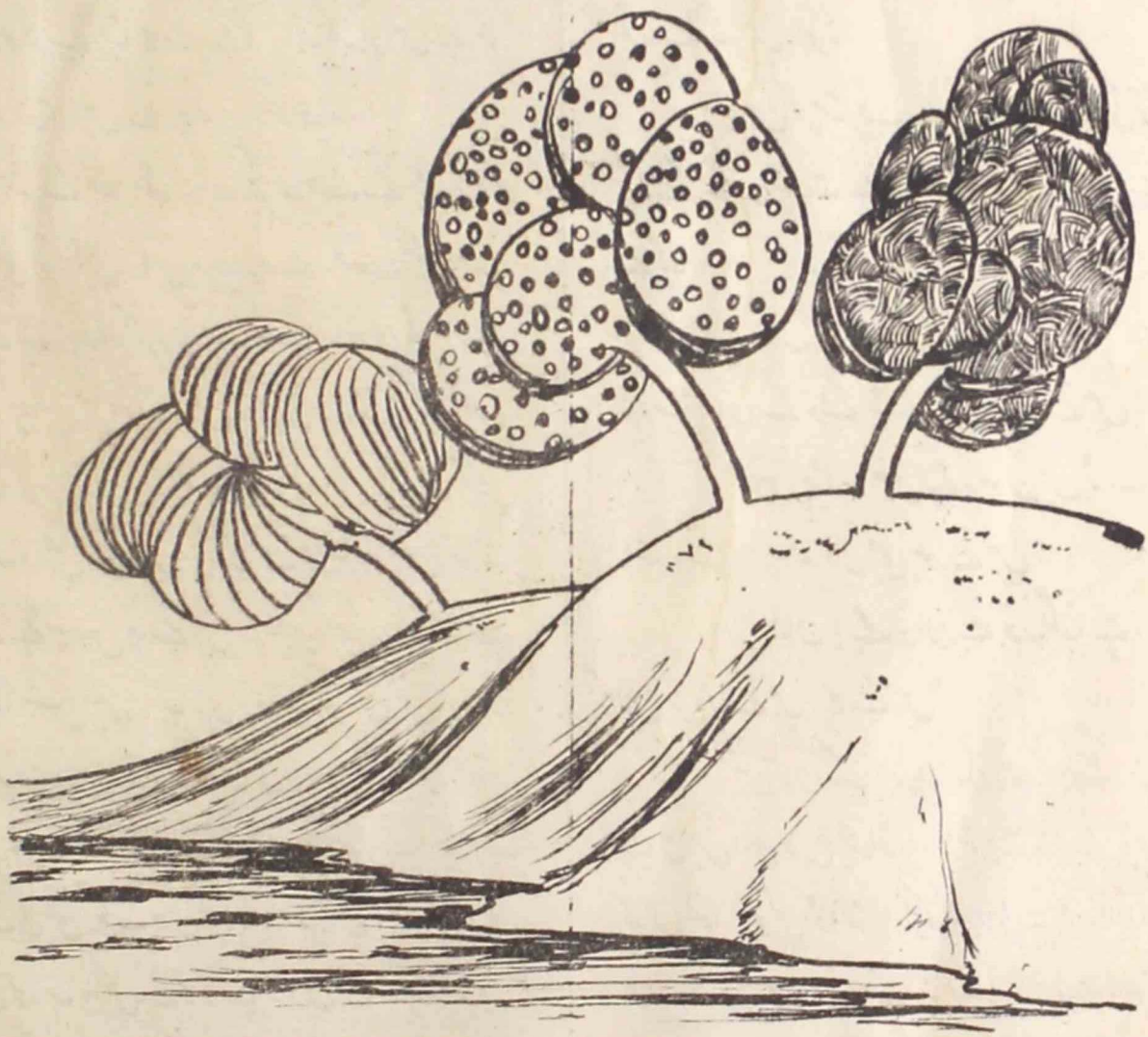

کراس اسٹیچ میں بیل

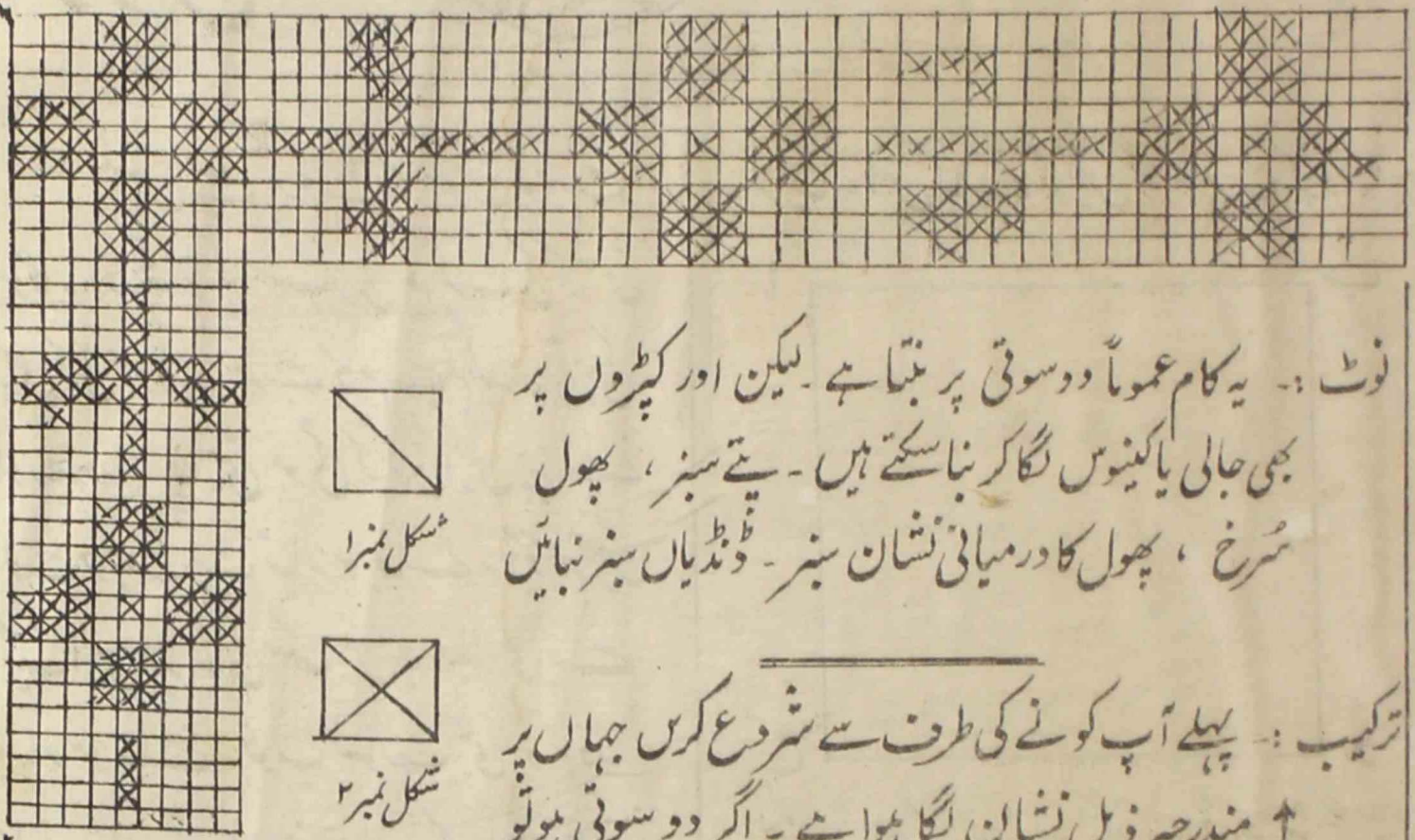

نوٹ :- یہ کام عموماً دو سوتی پر بنتا ہے۔ لیکن اور کپڑوں پر بھی جالی یا کینوس لگا کر بنا سکتے ہیں۔ پتے سبز، پھول سُرخ، پھول کا درمیانی نشان سبز۔ ڈنڈیاں سبز بنائیں

شکل نمبر ۱

شکل نمبر ۲

ترکیب :- پہلے آپ کونے کی طرف سے شروع کریں جہاں پر ↑ مندرجہ ذیل نشان لگا ہوا ہے۔ اگر دو سوتی ہو تو چھ اور اگر کینوس ہو تو تین تار دائیں طرف چھوڑ کر سوئی نکالئے۔ اور نیچے کی طرف دو تار چھوڑ کر دائیں طرف سے ڈال کر بائیں ہاتھ نکال لیجئے۔ جیسا کہ شکل نمبر ۱ میں دکھایا گیا ہے۔ پھر آپ اوپر کے حصّے میں دائیں طرف سوئی ڈال کر نیچے کی طرف نکال لیں۔ اب آپ دیکھیں گی کہ ایک ضرب کا نشان بن گیا ہے۔ جیسا کہ شکل نمبر ۲ میں دکھایا ہے۔ اب آپ ہر اک خانے میں جہاں بیل بنانی ہے یہی ضرب کا نشان بنا لیجئے۔ اگر آپ بیل کسی میز پوش یا کشتی پوش میں بنائیں تو نقشہ دیکھ کر کونے بھی موڑ سکتی ہیں۔ یہ بیل آپ کشتی پوش، میز پوش، قمیص، شلوار کے پائینچوں پر بنا سکتی ہیں۔

(زہرا خاتون)

تلادانی

از درۃ البیضا بیگم۔ منیجر مسلم گرل اسکول۔ پانی پت

تمھیں سینے پرونے کا شوق تو بہت ہوگا۔ اور کچھ نہ کچھ سلائی تم کرنے کی کوشش بھی کرتی ہوگی۔ مگر لمبے کام سے تم گھبرا جاتی ہوگی اور ضرور یہ چاہتی ہوگی کہ کوئی ایسی چیز بنانے کو ملے جو جھٹ پٹ تیار ہو جائے۔ آؤ ہم تمھیں ایک ایسی چیز بنانی سکھائیں جو جلدی سے تیار ہو جائے۔ خوب صورت بھی ہو اور کارآمد بھی۔ تم نے اپنی اماں کے پاس تلادانی دیکھی ہوگی۔ تم بھی اپنی سلائی کی چیزیں رکھنے کے واسطے ایک تلادانی بنالو۔ دیکھو کیسی جلدی سے بن کر تیار ہو جاتی ہے۔

اپنی اماں سے ایک کپڑا مانگ لو جو نہ بہت موٹا ہو۔ نہ ململ جیسا باریک پہلے پہل سلائی کرنے کے واسطے تو پرانا کپڑا بھی کافی ہے۔ مشق ہو جائے تو نیا کپڑا استعمال کر لینا۔ اس کپڑے کو تین گرہ مربع کرو۔

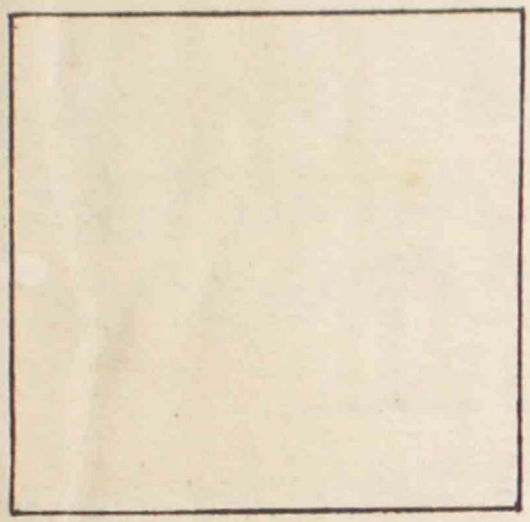

یعنی ایسا چوکور کاٹو جس کی لمبائی بھی تین گرہ ہو۔ اور چوڑائی بھی۔ اس کے چار خانے ہوں گے۔ ا، ب، ج، د

ا اور ب کو ملا کر باریک باریک بخیہ کر لو۔ اسی طرح ا اور ج کو ملا کر سی لو۔ اس طرح لفافے کی شکل بن جائے گی اس کے بعد "ب" سے "د" تک اور "ج" سے "د" تک نہایت صفائی سے آدھ انگل

چوڑا ترپ لو۔ "د" پر کوئی پاؤ گز لمبا موٹا ڈورا یا فیتا ٹانک دو۔ اب تمھاری تلادانی تیار ہے۔ اس میں تم فوراً اپنا سوئی دھاگا رکھ سکتی ہو۔ سوئیاں اوپر کی طرف لگا دو تاکہ گرنے سے محفوظ رہیں۔ اندر دھاگے کی ریل، قینچی، کپڑے کے چھوٹے موٹے ٹکڑے رکھ کر لپیٹ دو۔

کنگھی رکھنے کے واسطے بھی تم تلادانی استعمال کر سکتی ہو۔ تاکہ گرد و غبار سے محفوظ رہے۔ قرآن شریف کے واسطے جزدان اور کتابوں کا بستہ بھی اسی طرح سے سلتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ تلادانی چھوٹی ہوتی ہے اور جزدان بڑا ہوگا اور جو قرآن شریف اس میں رکھنا ہو

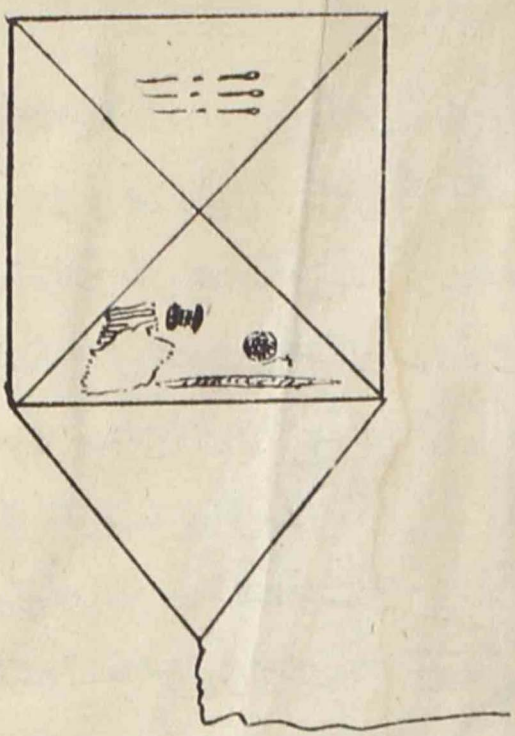

اس کی پیمائش کے مطابق بنے گا اس کی ترکیب پھر کبھی تمھیں بتائیں گے۔

رومال کے کونے کا خوبصورت پھول

پہلے ایک چوکور کپڑا لے کر اسے چاروں طرف سے باریک باریک ترپ لو پھر رومال کے ایک کونے پر اس پھول کو صفائی سے اتار لو۔ اب ڈی ایم سی کی لچھیوں سے یا کسی اور قسم کے باریک دھاگے سے اسے کاڑھو بڑا پھول ہلکا گلابی، پتیاں دھانی۔ ڈنڈیاں گہری سبز اور دونوں چھوٹے پھول کاسنی رنگ کے کاڑھو

منسر صالحہ عابد حسین

خوشی کی قید

بھلا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہوگا جس نے اپنی خوشی سے قید۔ وہ بھی تنہائی کی قید قبول کی ہو۔ تمھیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ آج سے ستّر اسّی سال پہلے ایک شخص نے یہ کر کے دکھا دیا قصہ یوں ہے کہ اپریل ۱۸۶۰ء میں انگلستان کے لارڈ سیسل اور امریکہ کے ایک نوجوان والٹر ہٹنگز ساتھ مل کر کھانا کھا رہے تھے۔ اس زمانے میں اٹلی کے ایک شخص کو قید تنہائی کی سزا ہوئی تھی لیکن اس نے سزائے موت کو اس پر ترجیح دی والٹر ہٹنگز نے کہا قید تنہائی کی ہیبت، خواہ مخواہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی ہے اس پر بحث ہونے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لارڈ سیسل نے کہا۔ اگر کوئی معقول آدمی دس سال کے لئے اپنی خوشی سے تنہائی کی قید میں رہے گا۔ اسے میں دس ہزار پونڈ دینے کو تیار ہوں۔ نوجوان امریکن نے لارڈ کی اس دعوت کو قبول کر لیا جتنے لوگ وہاں بیٹھے تھے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے

۱۲ فٹ چوڑی، ۱۵ فٹ لانبی کوٹھری تیار کی گئی۔ کچھ کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان اس کوٹھری میں رکھ دیا گیا۔ والٹر ہٹنگز ۲ مئی ۱۸۶۰ء کو اس میں داخل ہوا اور یکم مئی ۱۸۷۰ء کو اس میں سے نکلا۔

دس سال کی قید پوری ہو گئی تھی مگر بے چارے کا حلیہ

کچھ عجیب ہو گیا تھا۔ دیکھ کر ترس آتا تھا۔ چہرے پر جھریاں ڈاڑھی کے بال سفید براق، غرض ۳۵ سال کا نوجوان ۶۵ سال کا بڈھا معلوم ہوتا تھا صحت اتنی گر گئی تھی کہ آخر ۱۸۷۲ء میں چار سال کے بعد دنیا سے چل بسا۔

پہلا حملہ

پہاڑ پر چڑھنے کے لئے کچھ قلیوں کا اور انتظام کیا گیا جو اس کام کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور جنھوں نے ۱۹۳۲ء میں ہم لوگوں کو بہت مدد دی تھی۔ ان قلیوں کو 'بالٹی' کہا جاتا ہے۔ ان کے آنے کے بعد سامان اوپر بھیجنا شروع کیا گیا۔ مسٹر مرکل نے مجھ کو مسٹر مولر ہیر اور وائلینڈ کو آگے بڑھنے کے لئے حکم دیا۔ میرے بھیجنے کا مقصد آبشاروں اور چوٹیوں کی فلم تیار کرنا تھا۔ ۲۶ مئی کو ہم لوگ اپنے بنیادی خیمے پر پہنچ گئے۔ یہاں پر قلیوں نے سامان تیار کر رکھا تھا۔ اس جگہ ہم نے اپنے پیٹرول سے جلنے والے چولھوں کا بھی تجربہ کیا۔

دوسرے دن وائلینڈ سامان کی دیکھ بھال میں مشغول ہوئے اور میں مع مولر ہیر کے فوٹو لینے کے خیال سے آگے بڑھ گیا۔ ننگا پربت سامنے نظر آرہا تھا۔ یہاں سے تقریباً ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اس کی چوٹی ہے رسیوں کے ذریعے ہم لوگوں نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ دارجیلنگ کے قلیوں کو اس کام میں کافی مہارت تھی اور ان کی مدد سے ہم لوگ اوپر چڑھ گئے، جیسے جیسے اوپر چڑھتے جاتے برف زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ رکھیات آبشار کے مقابل پہنچ گئے اور یہاں ہم نے اپنا پہلا کیمپ نصب کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان سب باتوں سے فرصت پاکر ہم لوگ بنیادی کیمپ پر واپس آگئے۔ دوسرے دن صبح کو مسٹر ولز بناخ اور ہارکسل قلیوں کی آگے والی پارٹی کو مدد دینے کے خیال سے روانہ ہوئے۔ شام کو ریڈیو کے ذریعے انھوں نے اپنی خیریت سنائی۔ اس کے تیسرے دن تین آدمی اور روانہ کئے گئے۔ وہ دن ڈاک کے پہنچنے کا تھا۔ ہر شخص کی بیتابی دیکھنے کے قابل تھی۔ کوئی ڈاک کا تھیلا چھین لے رہا تھا کوئی اخبار لے کر بھاگا جارہا تھا عجب ہنگامہ تھا، مگر ہمارے بڑے صاحب کے رعب کی وجہ سے یہ ہنگامہ جلد ہی فرو ہوگیا۔

ایک دن 'بالٹی' قلیوں نے ہڑتال کردی۔ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ دارجیلنگ والے قلیوں کو پانچ روپے روزانہ دیئے جاتے ہیں۔ اس وقت ہم کو ان قلیوں کی سخت ضرورت تھی مگر روپیہ کی کمی کے سبب ان کے ساتھ رعایت ممکن نہ تھی۔ اس موقع پر جمعدار لیوا نے بڑی دلیری سے کام لیا۔ اس نے ان سب کو ڈانٹا اور ان کے بدن پر جتنے کپڑے تھے سب اتروالئے اور بطور سزا کے ان سے برف کا ایک زبردست تودا کاٹنے کو کہا جس کا کھودنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کی یہ حکمت عملی کام دے گئی اور بارہ قلیوں نے بڑے صاحب کے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ بقیہ کو فوراً رخصت کر دیا گیا۔ مسٹر وائلینڈ نے ایک خط مسٹر مرکل کو ان دنوں کے حالات کا لکھا تھا۔ اس سے پورا پورا حال معلوم ہوگا۔

"بنیادی کیمپ سے عارضی بنیادی کیمپ کو"

یکم جون۔ ساڑھے دس بجے صبح"۔

"۱۔ موسم بہت اچھا ہے۔ ہر شخص کام پر لگا ہوا ہے سامان کی درستی۔ کھدائی۔ تصویر کشی جاری ہے۔

۲۔ کل صبح (۲ جون) برنارڈ۔ سنگسٹر۔ بشٹو لڈ اور مولر ہیر مع سات دارجیلنگ کے قلیوں کے روانہ ہوجائیں گے

ان کے ساتھ سولہ بالٹی بھی ہونگے۔

۳۔ پرسوں صبح کو برنارڈ اور سنگسٹر تین یا چار دار جیلنگ کے قلیوں کو لے کر دوسرے کمپ کے لئے روانہ ہوں گے تاکہ آنے والی پارٹی کے لئے سامان مہیا کریں۔ بشٹولڈ اور مولر سیر پہلے کمپ پر تصویریں لیں گے۔"

۴۔ "آج ایک دار جیلنگ کے قلی کو واپس بھیجا جا رہا ہے جو بیمار ہو گیا ہے۔ سامان جلد روانہ کیا جائے۔"

۵۔ مسٹر فرائیر (انگلش ریزیڈنٹ) کو بتا دیا جائے کہ ہم لوگ بیس بالٹی قلیوں کو رکھ لیں گے باقی کو واپس کر دیا جائے۔

۶۔ آج ۴ بجے شام سے ۴ بجکر ۱۰ منٹ تک مسٹر بشٹولڈ ریڈیو پر بات کریں گے۔ اس کے بعد دس منٹ تک وہ آپ لوگوں کی گفتگو سنیں گے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد مقرر بدل جائے گا یعنی شروع کے پانچ منٹ میں یہاں سے گفتگو ہو گی اور اس کے بعد آپ کے یہاں سے۔ یہ سلسلہ ۴ بج کر ۵۵ منٹ تک جاری رہے گا لہروں کا نمبر ۵۰ و ۷۶ اور ۶۸ و ۴۳ ہو گا۔ اس کا خیال بہت ضروری ہے۔

۷۔ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اس محکمے کے افسران کو مطلع کر دیا جائے کہ وہ ان لہروں میں مخل نہ ہوں۔

۸۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ آپ سب کا بہی خواہ ولی

مسٹر واٹلینڈ کی مستعدی کی وجہ سے پہلے کمپ سے یہاں تک دو تین چکر کرنا پڑے۔ دوسرے کمپ سے ولز بناخ نے جو خط لکھا تھا اس سے مزید حالات معلوم ہونگے۔

"دوسرا کمپ۔ یکم جون ۱۹۳۴ء

"پہلے کمپ کے صاحب لوگوں کے نام۔

ہم نے پہلا کمپ کل ۷ بجے صبح چھوڑا۔ گیارہ بجے تک ہم سب برف میں ڈھک گئے۔ قلیوں کو اس سے بہت تکلیف پہنچی۔ ان کے لئے آگے بڑھنا غیر ممکن تھا۔ اس کے علاوہ ہمارا کافی وقت راستے کی تلاش میں ضائع ہوا۔ چنانچہ ایک عارضی کمپ (۱۶،۴۰۰ فٹ) پر بنایا گیا۔ قلیوں کی آخری کھیپ تین بجے سہ پہر کو آئی۔

"آج صبح ہم لوگ ساڑھے چھ بجے روانہ ہوئے۔ راستے کی تلاش میں کچھ وقت خراب ہوا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد ہم کو ہموار میدان مل گیا۔ ۱۰ بجے تک ہم لوگ ایک سطح مرتفع پر پہنچ گئے۔ جہاں ہم نے دوسرا کمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ یہ مقام ۱۷،۵۵۰ فٹ پر ہے۔ تقریباً اسی جگہ ۱۹۳۳ء میں کمپ لگایا گیا تھا۔ ہم سب قلیوں کو نیچے بھیج رہے ہیں۔ صرف اردلی اور باورچی رہ جائیں گے کیونکہ کھانے کا سامان ختم ہو گیا ہے۔ کل ہم تیسرے کمپ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ جو قلی اسوقت نیچے جا رہے ہیں ان کی چھولداریاں اور کمبل ہم نے رکھ لئے ہیں۔"

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ کل روانہ ہو جائیں تو براہ مہربانی قلیوں کو کل (۲ جنوری) شام تک مع کھانے کے سامان کے روانہ کر دیجئے۔ ایک کنستر پیٹرول اور ہمارے ذاتی سامان کے بورے بھی بھیج دیجئے گا لیکن قلیوں پر زیادہ سامان نہ لادا جائے کیونکہ ان کو پھر چڑھائی پر جانا ہے۔ اس کے علاوہ دھوپ کی عینکیں۔ صاحب لوگ اور قلیوں کے لئے سگریٹ اور ریڈیو والو (Valve) کو نہ بھول جائیے گا۔"

آپ کا خیر طلب ولی"

ہم لوگ بھی اس کے بعد پہلے کمپ سے ہو کر دوسرے کمپ کے لئے روانہ ہو گئے۔ سب سے آگے جانے والی پارٹی

چوتھے کیمپ کا راستہ بنا رہی تھی اور مسٹر اشبرینر نے خط کے ذریعے ہم کو اطلاعات بھیجیں۔

"از عارضی کیمپ نمبر ۳۔ ۶ رجون۔

"صبح کے وقت برف ہم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ ولو (ولزبناخ) اور بالبو (ڈرکسل) نے دوسرے کیمپ سے تیسرے کیمپ تک ایک مفید راستہ معلوم کر لیا ہے۔ تیسرا کیمپ ۴۰۰ و ۱۹ فٹ پر لگایا گیا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے راستہ سے اب راستہ بدلا ہوا ہے۔"

۷ رجون۔

آج پارہ ۲۲ ڈگری پر ہے، ہلکے ہلکے بادل ضرور ہیں مگر طوفان نہیں ہے۔ آج صبح ولزبناخ ہمارے خیمے میں آئے اور کہا کہ رات بھر ڈرکسل کو تکلیف رہی۔ یہ سن کر میں وہاں گیا۔ اور ڈرکسل کو دیکھ کر ان سے نیچے چلے جانے کو کہا۔ میں نے اور شنیدر نے چوتھے کیمپ کا راستہ تلاش کیا سہ پہر تک ہم لوگ واپس آ گئے۔ ڈرکسل نے ریڈیو کے ذریعہ بنیادی کیمپ سے گفتگو کی اور جواب میں مسٹر مرکل کا اظہار خوشنودی سنا۔ ۴ بجے ڈرکسل کو تکلیف زیادہ ہونے لگی اور انھوں نے دوسرے کیمپ کی واپسی کا ارادہ کیا اور ہم لوگوں سے چوتھے کیمپ پر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔"

ایک حادثۂ جانکاہ

ہم لوگوں کے دن بڑے اطمینان سے کٹ رہے تھے۔ کسی بری بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا یکایک ۷ رجون کو مسٹر ڈرکسل کا اردلی ہانپتا کانپتا ہوا آیا اور یہ خبر بد سنائی کہ بالبو صاحب (قلی ان کو اسی نام سے پکارتے تھے) سخت بیمار ہو گئے ہیں اور بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے اس غیر متوقع اور متوحش خبر کو سن کر ہم لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مسٹر مولر ئیر اور میرا اردلی پاسنگ تیسرے کیمپ کی طرف بھاگے اور میں نے چائے بنانا شروع کی دس منٹ بعد یہ لوگ مع الفرڈ ڈرکسل کے آ گئے۔ الفرڈ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور سانس تیزی سے چل رہی تھی اس وقت اس سے زیادہ اور کوئی بات نہ تھی۔ ہم لوگوں کے پاس اس وقت سامان میں صرف ایک خیمہ اور ایک بستر تھا، بیمار کو آرام پہنچانے کے خیال سے اور سامان مہیا کرنے کے لئے مولر ئیر نے اسی وقت شب میں پہلے کیمپ پر جانے کا ارادہ کر لیا تاکہ وہاں سے وہ مع سامان اور ڈاکٹر کے دوسرے دن صبح کو یہاں پہنچ جائیں۔ ان کے جانے کے بعد میں ڈرکسل کے برابر لیٹ گیا اور ان کا جی باتوں سے بہلانے لگا۔ آدھی رات کے قریب ان کو نیند آ گئی مگر میری آنکھوں سے نیند قطعی غائب تھی اور اس رات کا کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی، اور خلاف توقع ڈرکسل اسوقت بشاش تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگوں کو پہلے کیمپ پر واپس جانا چاہیئے میں نیچے اترنے کا سامان پورا ابھی نہ کرنے پایا تھا کہ ان کی حالت میں یکایک تبدیلی شروع ہوئی اور واپس جانے کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔ میں نے گھبراہٹ میں پاسنگ کو ایک خط لے کر تیسرے کیمپ پر بھیجا تاکہ وہاں سے مسٹر ولزبناخ مع خیمہ اور بستر کے ہمارے پاس آ جائیں پھر تیلا پاسنگ تین گھنٹہ کے مختصر عرصہ میں واپس آ گیا اور کہا کہ "وہاں نہ صاحب لوگ ہیں نہ قلی"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ

چوتھے کیمپ پر بڑھ گئے تھے۔

۱۰ بجے کے بعد سے مسٹر ڈرکسل غافل ہو گئے۔ میں نے بار بار ان کا نام لے کر پکارا اور کندھے ہلائے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ قدرت ان کو تھپکی دے کر سلا رہی تھی۔ پہاڑوں پر سے برف کی چٹانوں کے گرنے کی آوازیں چلی آ رہی تھیں میں اپنے بیمار دوست کے پاس تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ سوائے غم کے اس وقت میرا کوئی شریک نہ تھا۔ ڈرکسل کی حالت لمحہ بہ لمحہ گرتی جا رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر دوبارہ پاسنگ کو پہلے کیمپ پر روانہ کیا۔ وہ وہاں سے ساڑھے پانچ بجے شام کو مع مسٹر مولر یئر اور ڈاکٹر برنارڈ کے واپس ہوا۔ ان لوگوں کے آنے سے میری ہمت بندھی اور اپنے بیمار دوست کی صحت کی امید ہونے لگی۔

اگرچہ چڑھائی کی تھکن سے دونوں چور ہو رہے تھے لیکن ڈاکٹر برنارڈ نے نہ تو کھانے کی پرواہ کی اور نہ پینے کی۔ آتے ہی اپنے بیمار دوست کی دیکھ بھال میں لگ گئے اور جلد ہی پتہ چلا لیا کہ مریض نمونیہ کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ مگر اس وقت کی تکلیف نے ان کو بھی گھبرا دیا اور اپنی امکانی کوشش ختم کر دینے کے لئے فوراً ہی انھوں نے پاسنگ کو ایک قلی کے ساتھ پہلے کیمپ پر روانہ کیا تاکہ وہاں سے آکسیجن کا بکس لائے۔ مولر یئر نے ڈاکٹر کی بہت مدد کی اور میں تو تھک کر الگ جا پڑا تھا۔ ادھر بیمار کی یہ حالت تھی اُدھر برف کا طوفان تھا کہ برابر جاری تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ موت اس نوجوان کی زندگی کا خیر مقدم کرنے آ رہی تھی۔ بارش کھل گئی اور ڈوبتا ہوا سورج آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور جلد ہی سب مرحلے طے ہو گئے۔ شب کے ۹ بجکر بیس منٹ پر ڈرکسل مسکراتے ہوئے ابدی نیند سو گئے غم کی وجہ سے ڈاکٹر کا برا حال تھا اور ہم لوگ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ قلیوں کے دلخراش نالے جگر کے پار ہو رہے تھے۔

تین بجے صبح کو ایک روشنی دور سے نظر آئی۔ بہادر وائلینڈ قلیوں کے سروں پر آکسیجن کا بکس رکھوائے چلے آ رہے تھے۔ لیکن اب اس کی کیا ضرورت تھی! وائلینڈ نے اس خبر کو سنتے ہی ایک پچھاڑ کھائی۔

صبح ہونے سے پہلے ایک آدمی کو چوتھے کیمپ پر اس خبر کے ساتھ دوڑ آیا۔ سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر میت کا اٹھانا بھی ایک زبردست کام تھا۔ چوتھے کیمپ سے وہ لوگ جلد ہی پہنچ گئے۔ اسوقت پورا عملہ موجود تھا قلیوں میں وہ لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے مرحوم کے آخری وقت میں نوکروں کی طرح خدمت نہ کی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی گھرانے کے سب لوگ ہیں۔ اور اپنے کسی عزیز کی تیمارداری میں خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ میت کے لئے سب نے مل کر پھول اکٹھے کئے۔ اور بہت ہی مستعدی سے قبر کھودی گئی

۱۱ جون کی دوپہر کو پہاڑوں کے دامن میں الفرڈ ڈرکسل کی نعش کو سپرد خاک کیا گیا۔ مسٹر مرکل نے قبر کے کونے پر کھڑے ہو کر چند الفاظ کہے جس میں انہوں نے اپنے سفر کا مقصد بیان کرتے ہوئے مسٹر ڈرکسل کی دلیرانہ موت کا تذکرہ کیا۔ اور اُن کی اس بے وقت جدائی سے جو صدمہ ہم لوگوں کو پہنچا تھا اسکا اظہار کیا۔ سب سے بڑھ کر انھوں نے مسٹر ڈرکسل کے والدین کی طرف توجہ دلائی۔

مگر فوراً ہی نگاپربت کا ذکر کیا تاکہ ہم لوگ اپنے مقصد اصلی سے غافل نہ ہوجائیں۔

پہاڑیوں نے اپنی زبان میں موت کا پہاڑی نغمہ گایا وہ منظر بھی انتہائی دردانگیز تھا۔ مسٹر ڈرکس کی قبر پر پھول چڑھاکر ہم لوگ رخصت ہوگئے

دُوسرا حملہ

اپنا مقصد یاد دلانے کے لئے ہمیں کسی کی یاددہانی کی ضرورت نہ تھی مرحوم کی تجہیز وتکفین سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ چڑھائی کی تدابیر سوچی گئیں۔ قلیوں نے بیحد وفاداری کا ثبوت دیا۔ دوسری چڑھائی کی تیاری شروع ہوتے ہی انھوں نے سامان اٹھانے کی آمادگی فوراً ظاہر کی۔ روانگی سے قبل عزیزوں اور دوستوں کو خط اور تار روانہ کئے گئے۔ ۱۲ رجون کو لیوا کی سرکردگی میں قلی چوتھے کیمپ کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دو انگریز دوست بھی تھے جو کشمیر سے ہمارے ساتھ ہوگئے تھے۔ قلیوں کی روانگی کے بعد ہم لوگ اپنے مرحوم دوست کی قبر بنانے میں مصروف ہوگئے۔ چٹانوں پر سے پتھر لالاکر برابر جمادئے گئے اور اس طریقہ سے اپنے ایک وفادار دوست کی یادگار ہم لوگوں نے قایم کی۔

چند دنوں کے بعد لیوا ایک بُری خبر لے کر آیا، یعنی اس عرصہ میں اوپر برفباری بہت ہوئی تھی اور پہلے کیمپ کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ چوتھے کیمپ پر جو دس بالٹی جارہے تھے ان میں سات بیمار پڑگئے تھے اور تیسرے کیمپ سے آگے کوئی نہ بڑھ سکا تھا۔ اس تکلیف کی وجہ سے وہ لوگ آگے جانے سے انکار کررہے تھے۔ لیکن جب ڈاکٹر برنارڈ نے ان کی نبض دیکھی تو کوئی خرابی نہ پائی۔ لیوا نے اس وقت اپنا پرانا حربہ استعمال کیا یعنی جن قلیوں نے آگے جانے سے انکار کیا، ان کی وردی وغیرہ چھین کر ان کو برخاست کرنے کی دھمکی دی۔

روانگی سے پہلے ڈاکٹر برنارڈ نے پھر ہم لوگوں کا معائنہ کیا۔ ہر شخص کے پھیپھڑوں کی جانچ کی اس موقع پر مسٹر ولزبناخ سب سے آگے نکل گئے۔ امتحان کے اس موقع پر سانس کا روکے رکھنا بہت ہی مشکل تھا۔ مزہ جب آیا ہے کہ خون کی جانچ کرنے کے لئے ڈاکٹر برنارڈ نے ہر ایک کے کان کی لَو میں سے خون کھینچا تھا۔ اور سب کو تکلیف ہوئی تھی۔

دوسرے کیمپ سے یہ خبر آئی کہ شنیدر کا اردلی پاسنگ نمبر ۲ سخت زکام اور گٹھیا میں مبتلا ہوگیا ہے۔ غریب ڈاکٹر کو بلا پس وپیش وہاں جانا پڑا۔ پاسنگ کو بنیادی کیمپ تک پہنچانا بھی بہت مشکل کام تھا۔

ہماری پریشانیاں اسی حد تک نہ تھیں بلکہ قدرت ہمارا امتحان پورے طور پر لے رہی تھی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے پہاڑی گیہوں (جن کو سمپا کہتے ہیں) ہم تک نہ پہنچ سکے تھے جس کی وجہ سے خواہ مخواہ ہماری روانگی میں دیر ہوئی۔ کیونکہ غذا کا کافی انتظام کئے بغیر ہم لوگ روانہ نہیں ہوسکتے تھے۔ مگر اس دیر سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کچھ دلچسپ تحقیقات کے مواقع ہم لوگوں کو مل گئے۔ یعنی ولی وائلینڈ سینگسٹر بلدر کی چوٹی پر چڑھ گئے اور میں مع مرکل۔ ولزبناخ اور مولر سیر وغیرہ کے ساڑھے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا جہاں سے نگاپربت کے شمال مغربی رُخ کا پورا پورا منظر سامنے تھا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن ہم لوگ ہشاش بشاش تھے اور اتنے دن آرام کرنے سے جو کاہلی بدن میں

آگئی تھی اس کی جگہ اب پھرتی تھی۔

ایک دن ڈاک والا بھی پہنچ گیا۔ اگرچہ وہ دیر سے آیا تھا لیکن ڈاک ملنے کی خوشی میں کسی شخص نے بھی اس دیر کی طرف توجہ نہ کی بلکہ ڈاک کے تھیلے پر ٹوٹ پڑے۔ یورپ کے ہر ملک سے خطوط آئے تھے۔ ہندوستان کے چاروں طرف سے لوگوں نے دریافت حال کیا تھا غرض دنیا بھر سے خطوط اور اخباروں کا ایک انبار تھا اور ہر شخص اُن کے دیکھنے میں محو تھا۔

اس دفعہ ہماری روانگی دو پارٹیوں میں کرکے طے ہوئی۔ اور یہ دونوں پارٹیاں دو دو دن کے وقفے سے روانہ ہونے والی تھیں۔ ہر ایک چیز انتہائی غور و خوض کے بعد ٹھیک کی گئی۔ ہر ایک صاحب لوگ اور قلی کو ان کی روانگی کا وقت اور ڈیوٹی بتا دی گئی۔ جب سمپا کے پہنچ جانے کی خبر سنائی گئی تو ہم لوگ بالکل تیار ہو گئے اور ہر ایک نے اپنے گھر آخری خطوط روانہ کئے۔ میں بھی اپنے خیمے میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اور ننگکا (بھیڑ کا بچہ) میرے پیچھے پیچھے تھا کئی روز سے ان کی دیکھ بھال سے بھی ہم لوگ غافل ہو گئے تھے۔ شام کے وقت چار غبارے آسمان پر اُڑتے ہوئے نظر آئے جس سے تیسرے کیمپ والوں کو پتہ لگ گیا ہوگا کہ ہم لوگ روانہ ہونے والے ہیں۔

۲۲ جون کو پہلی پارٹی روانہ ہوئی جس میں چھ صاحب لوگ اور چودہ قلی تھے۔ قلیوں نے اپنی رسم کے مطابق روانگی کے وقت آگ جلائی۔ سامان کی تیاری کی وجہ سے ہم لوگوں کو پہلے کیمپ پر پہنچنے میں دیر ہوئی۔ دھوپ ہو جانے کی وجہ سے برف بھی نرم ہو گئی تھی اور چڑھتے چڑھتے قلیوں کے پاؤں اندر دھنسے جا رہے تھے۔ بعض خطرناک جگہوں سے ان کو بڑی حفاظت سے نکالا گیا۔ ہمارے گلے سوکھے جا رہے تھے۔ سانس پھول رہا تھا اور اسوقت کوئی ٹھنڈی چیز پینے کی خواہش تھی۔ مسٹر مرکل کی نگاہ ہم سب پر تھی کہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوئی قلی برف کا ڈھیلا منہ میں نہ رکھ لے۔

دوسرے کیمپ میں مسٹر فرائر (انگریز ساتھی) ہمارے منتظر تھے جہاں انہوں نے ہمارے لئے شربت وغیرہ تیار کر رکھا تھا۔ وہ یہاں ایک ہفتہ سے تنہا ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمارا پرانا کیمپ برف کے نیچے دبا پڑا تھا۔ مسٹر فرائمر نے دانشمندی سے کام لے کر اس مرتبہ دوسری جگہ خیمہ نصب کرنے کے لئے منتخب کی تھی۔ یہاں کچھ دیر قیام کرنے کے بعد ہم لوگ تیسرے کیمپ کی طرف بڑھ گئے۔ یہ ۱۹۰۰۴ فٹ کی بلندی پر لگایا گیا تھا۔

۲۵ جون کو ہم لوگ چوتھے کیمپ (۲۰۰۰۳ فٹ) پر پہنچ گئے۔ یہ خیمہ ایک مرتفع سطح پر لگایا گیا تھا۔ یہاں بلدر کے کھنڈر صاف نظر آ رہے تھے۔ سامنے قراقرم پہاڑ تھا۔ اور نیچے رکھیات آثار پوری طاقت سے بہ رہا تھا۔

قلیوں کو یہاں سے تیسرے کیمپ پر سامان لانے کے لئے واپس جانا تھا اس لئے ہم لوگوں نے کچھ دنوں کی چھٹی منائی اور میں اپنا کیمرہ لے کر اوپر چڑھ گیا تاکہ وہاں پر کچھ اچھی تصویریں لے سکوں۔ مجھے یہاں کافی کامیابی ہوئی۔ ہمارے سامنے 'راما' نالا بہہ رہا تھا اور کچھ دور سلبرسٹل (برف کا کھڈ) تھا۔ اس کے پار نگا پربت اپنی پُر ہیبت بلندی کے ساتھ ہمارے

سامنے تھا۔

یکم جولائی کو ہم لوگ یہاں سے آگے روانہ ہوئے اس دن سردی بہت زیادہ پڑ رہی تھی۔ ایک قلی نے اظہار عقیدت کے لئے اپنی عبادت کا کپڑا مسٹر مرکل کے پاؤں کے پاس بچھایا اور دیوتاؤں سے اپنے آقا کی کامیابی کی دعا مانگی۔ برف پر جھک کر دوسرے قلی نے بڑے صاحب کے پاؤں چومے۔ سامان فوراً لادا گیا اور ہم لوگ رکھیاٹ کی چوٹی پر روانہ ہو گئے۔

کوہ رکھیاٹ کی فتح

اس چوٹی کی فتح کا خیال ہم لوگوں کے دماغوں میں عرصے سے گھوم رہا تھا۔ ۳۲ء کے برفباری کے تجربہ کے بعد اس دفعہ نندا کوٹ پربت تک پہنچنے کا خیال پرانے راستے سے نہ تھا۔ بلکہ رکھیاٹ کی چوٹی پر سے جانے کا ارادہ تھا۔ ہم میں سے ہر شخص اس راستے کو اختیار کرنے کا خواہشمند تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برف پر چلتے چلتے سب اکتا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ پہاڑی زمین ملے۔ کیونکہ رفتار ترقی ایسی جگہ پر بہت تیز ہو جاتی ہے۔

چوتھے کمپ سے پانچویں کمپ تک کا راستہ بہت آسانی سے طے ہو گیا۔ اگرچہ چڑھائی کی رفتار ذرا سست تھی اور سانس لینے کے لئے دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ اس کے سوا فوٹوگرافروں نے بھی خوش نما مناظر دیکھ کر دیر لگائی۔ ٹیڑھا راستہ ہونے کی وجہ سے چند تصویریں گہرائیوں اور بلندیوں کی خوب لی گئیں۔

دوسرے دن صبح کو قلی نیچے سے سامان لا رہے تھے اور اشنبرنیز۔ شنیدر اور ولز نباخ برف کے ڈھالو راستے سے رکھیاٹ کی چوٹی پر دھاوا بول رہے تھے مثل چیونٹیوں کے وہ لوگ آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے ان کو اس طرح چڑھتا دیکھ کر ہم لوگوں کو مسرت آمیز فکر دامن گیر تھی۔ اور ہم دیکھ رہے تھے کہ کدالوں سے کس طرح وہ لوگ راستہ بنا رہے تھے۔ برف کے تودے ادھر اُدھر ہٹا کر وہ لوگ رسّے باندھتے جا رہے تھے کہ سامان لے کر قلیوں کو چڑھنے میں آسانی ہو۔ جب شام کو وہ واپس ہوئے ہیں تو آدھا راستہ اس طریقہ سے تیار کر چکے تھے رات کو ٹھنڈ ہو گئی تھی اور مجھ کو مولر ئیر کے ساتھ ایک ہی بستر میں رات گذارنا پڑی۔ صبح اُٹھنے کے بعد ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہم نے ان کو چوتھے کمپ پر واپس بھیج دیا تاکہ طبیعت ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ کچھ آدمیوں کے ساتھ یہاں آجائیں۔

آج اشنبرنیز اور شنیدر نے چھٹی منائی مگر باہمت ولز نباخ خیمے میں نہ ٹھہرے۔ وہ ہر مشکل میں پیش پیش تھے سب سے پہلے راستہ بنانے کے لئے وہ روانہ ہوئے اور اس کے بعد میں قلیوں کے ساتھ رسّے لے کر پہنچا۔ جلد ہی میں دلی (ولز نباخ) کے پاس پہنچ گیا۔ دیکھا تو وہ ہانپ رہے تھے اور کچھ کھانسی بھی تھی۔ مگر ان کی ہمت ان سب پر حاوی تھی۔ مجھے ان کی ہمت پر رشک آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ برف کی سختی اور ٹھنڈ کی وجہ سے گلے جا رہے تھے اگرچہ میں ان کو اونی دستانوں سے ڈھکے ہوئے تھا مگر دلی کھلے ہوئے ہاتھوں سے برف کھود رہے تھے۔

چوتھی جولائی کی صبح کو دلی مرکل نے سب کو بیدار کیا اور جلدی جلدی تیاری کا حکم دیا۔ فوراً ہی سب لوگ احکام کے بموجب کمربستہ ہو گئے۔ اشنبرنیز اور شنیدر

کی سرکردگی میں پارٹیاں روانہ ہونا شروع ہوئیں۔ کچھ وقفے کے بعد میں مع مرکل، ولزبناخ، واٹلینڈ اور تین چار قلیوں کے روانہ ہوا۔ ہمارے ساتھ کچھ لوگ ایسے تھے جن کو کبھی اتنے ڈھالو راستے پر چڑھنے کا عمر بھر اتفاق نہیں ہوا تھا اور دارجیلنگ کے قلیوں کا تو آج امتحان کا دن تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سب مرحلے بآسانی طے ہو رہے تھے۔ اور رستوں کی رہنمائی سے ہم لوگ چھٹے کمپ تک بآسانی پہنچ گئے۔ شنیدر اور اشنبرینر یہاں پہلے سے ہمارے منتظر تھے۔ اسی مقام پر ۱۹۳۲ء میں ہم نے اپنا ساتواں کمپ لگایا تھا۔ یہاں پر کہر بہت گر رہا تھا۔ ٹمپریچر کی کمی کے باعث خون کی روانی میں کمی ہو جاتی ہے۔ اگر خون کی اس کیفیت کی وجہ سے رگیں سکڑ جائیں تو حالت بہت خطرناک ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ بلندی پر درخت نہیں اُگتے۔ سامنے سلبرسٹل کا درّہ تھا جس کا ہم نے ہی دو سال قبل یہ نام تجویز کیا تھا۔ چھٹے کمپ (۱۸۸۱۰ فٹ) تک پہنچنے میں میری طبیعت خراب ہو گئی اور اس بیماری کا اثر ہوا جو کو پہاڑی بیماری MOUNTAIN SICKNESS کہا جاتا ہے جتنا اس بیماری پر قابو پانے کی کوشش کیجائے اتنا ہی اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔

رات کو بہت دیر تک ہم لوگ گفتگو کرتے رہے مگر سب کی گفتگو کا موضوع ایک ہی تھا یعنی نگا پربت۔

منزل کے قریب

خیموں کی بے ترتیبی کے باوجود ہم لوگ رات کو خوب اچھی طرح سوئے۔ لیکن دوسرے دن کی صبح کچھ اچھی خبر لے کر نہ آئی۔ بلندی پر سامان لے جانے والے تین بہترین قلی بیمار پڑ گئے تھے۔ یہ تینوں ولزبناخ۔ مولر بتر اور میرے نوکر تھے۔ ان لوگوں نے اب نیچے جانا چاہا۔ قلیوں کی کمی تعداد نے اب تشویش پیدا کر دی۔ آج کی روانگی کا انتظام میرے سپرد ہوا۔ وائلینڈ مع ولزبناخ کے اوپر چڑھ گئے ان کے بعد اشنبرینر اور شنیدر بھی گئے۔ اس ڈھالو زمین کے نیچے راستہ بہت دلفریب ہے لیکن اس کے بعد ہی ۴۰۰ فٹ گہری ایک خندق ہے۔ ہمارے ساتھیوں نے بڑی محنت سے ہم لوگوں کے لئے راستہ تیار کیا تھا جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے راستہ ہموار ہوتا جاتا اور مناظر بھی دلفریب ہوتے جا رہے تھے۔ مگر چڑھائی مشکل تھی اور آرام لینے کے لئے دیر تک رُکنا پڑتا تھا کچھ دیر بعد ہم لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں ہمارے دوست ہمارے منتظر تھے اور وہیں پر انھوں نے ساتواں کمپ (۲۳۰۵۰ فٹ) لگایا تھا۔ برف کا طوفان اور سردی قیامت کی تھی اور اسی موسم میں ہم لوگ اپنے خیمے لگا رہے تھے۔

شام تک موسم صاف ہو گیا۔ ہمارے سامنے سلبرسٹل مقام تھا۔ یہ جگہ دو پہاڑی ستونوں کے درمیان ایک محراب تھی۔ اپنے خیموں سے ہم نگا پربت کی چوٹی کی مرتفع سطح کا بآسانی نظارہ کر سکتے تھے اور ہر شخص کا دل اس یقین سے پُر تھا کہ کل نہیں تو پرسوں یہ جگہ ہمارے پاؤں کے نیچے ہو گی۔

سورج غروب ہونے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے بستروں میں گھس گئے۔ موسم کی خرابی کا ذرا بھی شبہ نہ تھا البتہ یہ خیال تھا کہ اس شب کو سردی زیادہ ہو گی۔